فہرست

شذرات	بنگلہ دیش کی عدالت کا تاریخی فیصلہ	منظور الحسن	۲
	بم دھماکوں کی ذمہ داری	محمد بلال	۶
قرآنیات	البقرۃ (۲: ۱۳۸-۱۴۱)	جاوید احمد غامدی	۱۱
معارفِ نبوی	نومولود اور شیطان- بچے کا رونا اور شیطان- شیطان کے کارندے-اہل عرب اور شیطان	طالب محسن	۱۵
دین و دانش	قانون جہاد (۴)	جاوید احمد غامدی	۲۵
	سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور علوم نبوت (۲)	ابو سلمان سراج الاسلام حنیف	۲۹
یسئلون	متفرق سوالات	طالب محسن/محمد رفیع مفتی/محمد بلال	۳۷
تبصرۂ کتب	''مشاہدات حرم''	اختر حسین عزمی	۴۹
	''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ''	عبدالحی عابد	۵۲
نقطۂ نظر	شعائر اللہ اور فطرت اللہ	محمد وسیم اختر مفتی	۵۷
مدیر کے نام		محمد طارق	۶۳
ادبیات	ایک کہانی (بچوں کے لیے)	جاوید احمد غامدی	۶۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بنگلہ دیش کی عدالت کا تاریخی فیصلہ

بنگلہ دیش کی عدالتِ عالیہ نے طلاق کے ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے علما کے فتووں کو غیر قانونی قرار دیا ہے۔ عدالت نے پارلیمنٹ سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ جلد ایسا قانون وضع کرے کہ جس کے بعد فتویٰ بازی قابلِ دست اندازیِ پولیس جرم بن جائے۔ بنگلہ دیش کے علما نے اس فیصلے پر بھرپور ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے اس کے خلاف ملک گیر تحریک چلانے کا اعلان کیا ہے۔ اس ضمن میں علما کی ایک تنظیم ''اسلامک یونٹی الائنس'' نے متعلقہ ججوں کو مرتد یعنی دین سے منحرف اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

فتوے کا لفظ دو موقعوں پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک اس موقع پر جب کوئی صاحبِ علم شریعت کے کسی مسئلے کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ دوسرے اس موقع پر جب کوئی عالمِ دین کسی خاص واقعے کے حوالے سے اپنا قانونی فیصلہ صادر کرتا ہے۔ ایک عرصے سے ہمارے علما کے ہاں اس دوسرے موقعِ استعمال کا غلبہ ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس لفظ کا رائے یا نقطۂ نظر کے مفہوم میں استعمال کم و بیش متروک ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب فتوے کا مطلب ہی علما کی طرف سے کسی خاص مسئلے یا واقعے کے بارے میں حتمی فیصلے کا صدور سمجھا جاتا ہے۔ علما اسی حیثیت سے فتویٰ دیتے ہیں اور عوام الناس اسی اعتبار سے اسے قبول کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہمارے نزدیک، چند مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم مذکورہ فیصلے کے بارے میں اپنا تاثر بیان کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان مسائل کا جائزہ لے لیا جائے۔

پہلا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون سازی اور شرعی فیصلوں کا اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتا ہے جو قانون کی رو سے اس کے مجاز ہی نہیں ہوتے۔ کسی میاں بیوی کے مابین طلاق کے مسئلے میں کیا طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں ہوئی؟ ان کا نکاح قائم ہے یا باطل ہو گیا ہے؟ رمضان یا عید کا چاند نظر آیا ہے یا نہیں آیا؟ کوئی مسلمان اپنے کسی قول یا اقدام کی وجہ سے کہیں دائرۂ اسلام سے خارج اور نتیجۃً مسلم شہریت کے قانونی حقوق

سے محروم تو نہیں ہو گیا؟ یہ اور اس نوعیت کے بہت سے دوسرے معاملات سر تا سر قانون اور عدالت سے متعلق ہوتے ہیں۔ علما کی فتویٰ سازی کے نتیجے میں یہ امور گویا حکومت اور عدلیہ کے ہاتھ سے نکل کر غیر متعلق افراد کے ہاتھوں میں آ جاتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون کی حاکمیت کا تصور مجروح ہوتا ہے اور لوگوں میں قانون سے روگردانی کے رجحانات کو تقویت ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون اپنی روح میں نفاذ کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر اسے نفاذ سے محروم رکھا جائے تو اس کی حیثیت محض رائے اور نقطۂ نظر کی سی ہوتی ہے۔ غیر مجاز فرد سے صادر ہونے والا فتویٰ یا قانون حکومت کی قوتِ نافذہ سے محروم ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی پر کسی قسم کی سزا کا خوف نہیں ہوتا۔ چنانچہ فتویٰ اگر مخاطب کی پسند کے مطابق نہ ہو تو اکثر وہ اسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ فتویٰ یا قانون بے توقیر ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں رہنے والے شہریوں میں قانون ناپسندی کا رجحان فروغ پاتا ہے اور جیسے ہی انھیں موقع ملتا ہے وہ بے دریغ قانون کی خلاف ورزی کر ڈالتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تیسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر مجاز افراد سے صادر ہونے والے فیصلوں کو نافذ کرنے کی کوشش کی جائے تو ملک میں بدنظمی اور انارکی کا شدید اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب غیر مجاز افراد سے صادر ہونے والے قانونی فیصلوں کو حکومتی سرپرستی کے بغیر نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اپنے عمل سے یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ مرجعِ قانون و اقتدار تبدیل ہو چکا ہے۔ جب کوئی عالمِ دین مثال کے طور پر، یہ فتویٰ صادر کرتا ہے کہ سینما گھروں اور ٹی وی اسٹیشنوں کو مسمار کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، یا کسی خاص قوم کے خلاف جہاد فرض ہو چکا ہے، یا فلاں کی دی گئی طلاق واقع ہو گئی ہے اور فلاں کی نہیں ہوئی، یا فلاں شخص یا گروہ اپنا اسلامی تشخص کھو بیٹھا ہے تو وہ درحقیقت قانونی فیصلہ جاری کر رہا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، وہ ریاست کے اندر اپنی ایک الگ ریاست بنانے کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے انتشار اور انارکی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن علاقوں میں حکومت کی گرفت کمزور ہوتی ہے وہاں اس طرح کے فیصلوں کا نفاذ بھی ہو جاتا ہے اور حکومت منہ دیکھتی رہتی ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف مذہبی مسالک کی وجہ سے ایک ہی معاملے میں مختلف اور متضاد فتوے منظرِ عام پر آتے ہیں۔ یہ تو ہمارے روزمرہ کی بات ہے کہ ایک ہی گروہ کو بعض علماے دین کافر قرار دیتے ہیں اور بعض مسلمان سمجھتے ہیں۔ کسی شخص کے منہ سے اگر ایک موقع پر طلاق کے الفاظ تین بار نکلتے ہیں تو بعض علما

اس پر ایک طلاق کا حکم لگا کر رجوع کا حق باقی رکھتے ہیں اور بعض تین قرار دے کر رجوع کو باطل قرار دیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ایک عام آدمی کے لیے نہایت دشواریاں پیدا کر دیتی ہے۔

پانچواں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکمران اگر دین و شریعت سے کچھ خاص دلچسپی نہ رکھتے ہوں تو وہ اس صورتِ حال میں شریعت کی روشنی میں قانون سازی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ کام چل رہا ہے کے اصول پر وہ اس طریقِ قانون سازی سے سمجھوتا کیے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومتی ادارے ضروری قانون سازی کے بارے میں بے پروائی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور قوانین اپنے فطری ارتقا سے محروم رہتے ہیں۔

چھٹا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ رائج الوقت قانون اور عدالتوں کی توہین کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب کسی مسئلے میں عدالتیں اپنا فیصلہ سنائیں اور علما اسے باطل قرار دیتے ہوئے اس کے برعکس اپنا فیصلہ صادر کریں تو اس سے عدالتوں کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شہری عدلیہ کو چیلنج کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا ہے۔

ان مسائل کے تناظر میں بنگلہ دیش کی عدالتِ عالیہ کا فیصلہ ہمارے نزدیک، امت کی تاریخ میں ایک عظیم فیصلہ ہے۔ جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے اسے بجا طور پر صدی کا بہترین فیصلہ قرار دیا ہے۔ بنگلہ دیش کی عدالت اگر علما کے فتووں اور قانونی فیصلوں پر پابندی لگانے کے بجائے، ان کے اظہارِ رائے پر پابندی عائد کرتی تو ہم اسے صدی کا بدترین فیصلہ قرار دیتے اور انھی صفحات میں بے خوفِ لومۃ ولائم اس پر نقد کر رہے ہوتے۔

موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے علما اپنی اصل ذمہ داری کو ادا کرنے کے بجائے ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے پر مصر ہیں جن کے نہ وہ مکلّف ہیں اور نہ اہل ہیں۔ قرآن و سنت کی رو سے علما کی اصل ذمہ داری دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر اور تعلیم و تحقیق ہے۔ ان کا کام سیاست نہیں، بلکہ سیاست دانوں کو دین کی رہنمائی سے آگاہی ہے؛ ان کا کام حکومت نہیں، بلکہ حکمرانوں کی اصلاح کی کوشش ہے؛ ان کا کام جہاد و قتال نہیں، بلکہ جہاد کی تعلیم اور جذبۂ جہاد کی بیداری ہے؛ اسی طرح ان کا کام قانون سازی اور فتویٰ بازی نہیں بلکہ تحقیق و اجتہاد ہے۔ گویا انھیں قرآنِ مجید کا مفہوم سمجھنے، سنتِ ثابتہ کا مدعا متعین کرنے اور قولِ پیغمبر کا منشا معلوم کرنے کے لیے تحقیق کرنی ہے اور جن امور میں قرآن و سنت خاموش ہیں ان میں اپنی عقل و بصیرت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے اجتہادی آرا قائم کرنی ہیں۔ ان کی کسی تحقیق یا اجتہاد کو جب عدلیہ یا پارلیمنٹ قبول کرے گی تو وہ قانون قرار پائے گا۔ اس سے پہلے اس کی حیثیت محض ایک رائے کی ہوگی۔ اس لیے اسے اسی حیثیت سے پیش کیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حکم نہیں لگایا جائے گا، کوئی فیصلہ نہیں سنایا جائے گا، کوئی فتویٰ نہیں دیا جائے گا، بلکہ طالبِ علمانہ لب و لہجے میں محض علم و استدلال کی بنا پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ فلاں شخص کافر ہے، بلکہ اس کی اگر ضرورت پیش آئے تو یہ کہا جائے گا کہ فلاں شخص کا فلاں عقیدہ کفر ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ فلاں آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ فلاں آدمی کا فلاں نقطۂ نظر اسلام کے دائرے میں نہیں آتا۔ یہ نہیں کہا جائے گا فلاں آدمی مشرک ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا فلاں نظریہ یا فلاں طرزِ عمل شرک ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ زید کی طرف سے دی گئی ایک وقت کی تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ایک وقت کی تین طلاقیں واقع ہونی چاہییں۔

حکم لگانا، فیصلہ سنانا، قانون وضع کرنا اور فتویٰ جاری کرنا درحقیقت، عدلیہ اور حکومت کا کام ہے کسی عالمِ دین یا کسی اور غیر مجاز فرد کی طرف سے اس کام کو انجام دینے کی کوشش سراسر تجاوز ہے۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اس اصول کو ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی کتاب ''ازالتہ الخفاء'' میں لکھتے ہیں:

''اس زمانے تک وعظ اور فتویٰ خلیفہ کی رائے پر موقوف تھا۔ خلیفہ کے حکم کے بغیر نہ وعظ کہتے تھے اور نہ فتویٰ دیتے تھے۔ بعد میں خلیفہ کے حکم کے بغیر وعظ کہنے اور فتویٰ دینے لگے اور فتویٰ کے معاملے میں جماعت (مجلسِ شوریٰ) کے مشورہ کی جو صورت پہلے تھی وہ باقی نہ رہی ـــــ (اس زمانے میں) جب کوئی اختلافی صورت نمودار ہوتی، خلیفہ کے سامنے معاملہ پیش کرتے، خلیفہ اہلِ علم و تقویٰ سے مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرتا اور وہی سب لوگوں کی رائے بن جاتی۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ہر عالم بطورِ خود فتویٰ دینے لگا اور اس طرح مسلمانوں میں اختلاف برپا ہوا۔''

(بحوالہ ''اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل''، مولانا امین احسن اصلاحی، ص ۳۲)

ـــــ منظور الحسن

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بم دھماکوں کی ذمہ داری

پچھلے دنوں بھارت، دہلی کے لال قلعے میں ایک مسلح کارروائی ہوئی، جس میں کچھ بھارتی فوجی ہلاک ہو گئے۔اس کارروائی کی ذمہ داری پاکستان میں ایک ''جہادی'' مذہبی گروہ نے بڑے فخر سے قبول کی اوراخبارات کولال قلعہ کانقشہ جاری کر کے بتایا کہ ان کے افراد نے کس طرح یہ کارروائی کی۔

اس واقعہ کے بعد پاکستان میں ایک بم دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا کسی قلعے میں نہیں، بلکہ کراچی میں صدر جیسے معروف علاقے کے قریب شاہراہِ لیاقت پر تین منزلہ رہایشی اورتجارتی عمارت میں عید کی رات ہوا جس میں ایک تین سالہ بچی ہلاک اوراس کے والد، والدہ اور بھائی سمیت ۱۰افراد زخمی ہوئے۔ یہ دھماکا بھی دراصل ایک ''جہادی'' مذہبی گروہ کے دفتر میں ہوا تھا۔اس گروہ نے کہا کہ: ''یہ دھماکا لال قلعے میں ہماری کارروائی کا جواب ہے[1]،اس میں ''را'' ملوث ہے۔'' اس گروہ نے کہا کہ: ''معصوم شہریوں کوشہید کر کے بھارت نے بین الاقوامی قانون کے دھجیاں بکھیری ہیں۔اس کا بدلہ مجاہدین پرقرض ہے۔اس کا بدلہ سری نگراوردہلی میں لیا جائے گا۔''

اسی طرح پاکستان کے اول الذکر ''جہادی'' گروہ نے کہا کہ: ''یہ دھماکا لال قلعے کی کارروائی کے ردِعمل میں ہوا ہے۔ یہ بزدلانہ حرکت ہے۔'' اورساتھ یہ اعلان کیا کہ: ''اب ہم بھارت کے اندراہم فوجی چھاؤنیوں، پولیس عمارتوں اورتھانوں کونشانہ بنائیں گے۔'' اس گروہ نے کہا کہ: ''جہاد کے نام پرواجپائی کے پیروں تلے سے زمین نکل رہی ہے۔ واشنگٹن کے ایوان لرز رہے ہیں۔ہم دہشت گردنہیں۔ہم تو مظلوم پرظلم نہیں کرتے، بلکہ ظلم کے خاتمے کے لیے نکلے ہیں۔خدا نے ہمیں جہاد کے آداب سکھائے ہیں۔مجاہدین سڑکوں اورگاڑیوں میں دھماکا نہیں کرتے ......سنگینوں کے سائے تلے کسی قسم کے مذاکرات نہیں ہوں گے اور نہ کوئی بات سنی اور نہ کی جائے گی۔''

اُدھر بھارت میں دہلی کی شاہی مسجد کے امام اور بھارتی مسلمانوں کے ایک اہم رہنما مولانا سید احمد بخاری

[1] اب یہ خدا ہی جانتا ہے کہ دہلی کے لال قلعے میں کس گروہ نے کارروائی کی۔ ''جہادی'' گروہوں میں ایسی مسلح کارروائیوں کا ''کریڈٹ'' لینے کے بارے میں یہ صورتِ حال پیدا ہوتی رہتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے کہا کہ: ''ان گروہوں کی کارروائیوں سے بھارت میں مسلمانوں کے خلاف فرقہ دارانہ نفرت پیدا ہو رہی ہے۔'' انھوں نے ''جہادی'' گروہوں سے اپیل کی کہ: ''وہ بھارتی فوج کی یک طرفہ جنگ بندی کے جواب میں سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کریں۔'' انھوں نے بھارتی حکومت پر بھی زور دیا کہ: ''وہ کشمیر کے تمام نوجوانوں کو رہا کرے اور سرحد پار کر کے مجاہد گروپوں میں شامل ہونے والوں کے لیے عام معافی کا اعلان کرے۔''

ہم یہ بات ان صفحات پر بارہا کر چکے ہیں کہ دین و شریعت کے اعتبار سے جہاد و قتال کا حق صرف مسلمانوں کے حکمرانوں کو حاصل ہے۔ عام مذہبی گروہ جس طرح زانی کو کوڑے نہیں مار سکتے، چور کے ہاتھ نہیں کاٹ سکتے، اسی طرح جہاد و قتال بھی نہیں کر سکتے۔ قرآنِ مجید گواہ ہے کہ مخالفین کے شدید مظالم کے باوجود جب تک کسی نبی کو سیاسی اقتدار نہیں مل گیا، اس وقت تک اس نے کبھی جہاد و قتال نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جید اہلِ علم جہاد و قتال کے لیے سیاسی اقتدار کو لازمی شرط قرار دیتے ہیں۔ جہاد و قتال کے بارے میں یہ دین کی تعلیمات ہیں۔ یہ ہم اس وقت تک بیان کرتے رہیں گے اور بار بار بیان کرتے رہیں گے، جب تک ان کی خلاف ورزی جاری ہے۔

یہاں ہمارے پیشِ نظر حکمت و دانائی کے پہلو سے مولانا سید احمد بخاری کی بات کی تائید کرنا ہے۔ بلاشبہ یہ بات انبیا کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ انسانی جھگڑوں کے خاتمے میں عفو و درگزر اور رواداری کا رویہ غیر معمولی طور پر مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنے تنازعے سیاسی بصیرت سے حل کریں اور اس معاملے میں عفو و درگزر اور رواداری سے کام لیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بھارت کے چند فوجیوں کو ہلاک کر کے خوش ہونے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کے اقدام کا نتیجہ کیا نکل رہا ہے۔ ان کے اقدام سے ہو سکتا ہے کہ ایک واجپائی کو کچھ خوف محسوس ہو رہا ہو، مگر بھارت کے رہنے والے کروڑوں مسلمان یقینی طور پر واجپائی سے زیادہ خوف کا شکار ہو رہے ہیں۔ بھارتی مسلمانوں کے مذہبی رسالوں کے اداریے بارہا اس بات کا اظہار کر چکے ہیں۔ مولانا سید احمد بخاری کا بیان بھی اسی سنگین صورت حال کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں روزنامہ ''جنگ'' میں ایک خبر اس عنوان سے شائع ہوئی کہ: ''بھارتی مسلمانوں نے خوف میں عید منائی۔'' اور تفصیل میں لکھا گیا کہ: ''بھارت میں رہنے والے مسلمانوں نے بدھ کو عید الفطر دکھ اور خوف کے عالم میں منائی۔ لال قلعہ پر کشمیری مجاہدین کے حالیہ حملوں کی وجہ سے نمازِ عید کے اجتماعات پر انتہا پسند ہندوؤں کے حملے کا خطرہ تھا جس کے پیشِ نظر نماز عید کے اجتماعات کی حفاظت

کے لیے انتظامات کیے گئے۔ یوں مسلمانوں نے خوف و ہراس کے ماحول میں عید منائی۔''

اس سنگین صورتِ حال پر مزید غور کریں تو یہ سنگین تر محسوس ہونے لگتی ہے۔ غور کیجیے، جب یہ ''جہادی'' مذہبی گروہ بھارت میں کوئی کارروائی کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ بھارت کی حکومت اس کا پورا انتقام لیتی ہے، وہ بھارت کے مسلمانوں کی بالعموم اور کشمیر کے مسلمانوں کی بالخصوص زندگی کا گھیرا تنگ کر کے اور پاکستان کے رہایشی علاقوں میں بم دھماکے کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھاتی ہے۔ دہلی کے لال قلعے کی کارروائی کے بعد ۳ جنوری ۲۰۰۱ کو مقبوضہ کشمیر کے شہر کشتواڑ میں مکمل طور پر لکڑی سے بنی مرکزی جامع مسجد آتش زدگی کے واقعہ میں شہید ہوگئی۔ کشمیر کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی جبکہ مقامی مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ فائر بریگیڈ کے عملے نے بروقت آگ پر قابو پانے کی کوشش نہیں کی اور مسجد ایک گھنٹے کے اندر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ کس سلسلے کی کڑی ہوگا۔

اس صورتِ حال میں عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ''جہادی'' گروہ جب بھارت میں کسی مسلح کارروائی کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کا اعلان کرتے ہیں تو انھیں پاکستان میں ہونے والے بم دھماکوں کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر لینے کا اعلان کرنا چاہیے۔ ان دھماکوں میں معصوم امن پسند شہریوں کے قتل کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر لینے کا اعلان کرنا چاہیے۔ بچوں کے یتیم ہونے اور بیویوں کے بیوہ ہونے کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر لینے کا اعلان کرنا چاہیے۔ ٹانگوں اور بازوؤں سے محروم ہونے والے زخمیوں کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر لینے کا اعلان کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ انھی گروہوں کا کہنا ہے کہ اُن کی کارروائیوں کے جواب میں بھارت یہ دھماکے کرتا ہے۔ اسی طرح بھارت کے مسلمانوں کی پریشانیوں میں جو مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ان پر چھائے ہوئے خوف کے سائے جو مسلسل گہرے ہو رہے ہیں، اس کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر لینے کا اعلان کرنا چاہیے۔

پاکستان اور بھارت جیسے غریب ملکوں کی حکومتیں (جو جنگوں کو بالکل افورڈ نہیں کر سکتیں) باہمی تنازعات پُر امن ذرائع سے حل کرنے کے معاہدوں میں بندھی ہوئی ہیں، مگر افسوس ہے کہ یہ خود ان معاہدوں پر صحیح طرح عمل پیرا نہیں ہوتیں۔ اور جب کبھی یہ حکومتیں دانش کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذاکرات کا ماحول پیدا کرتی ہیں تو اسلام جیسے امن و آشتی کے پیامبر مذہب کو ماننے والے پاکستان کے یہ مذہبی لوگ ہی مذاکرات کی فضا کو خراب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح دنیا کو اسلام کا یہ باطل تاثر دینے کی غیر شعوری کوشش کرتے ہیں کہ

اسلام جنگ و جدال کو پسند اور سیاست و سفارت سے مسائل حل کرنے کو ناپسند کرنے والا دین ہے۔

دیدۂ بینا اور دلِ درمند رکھنے والے ہر مسلمان کے نزدیک یہ بہت سنگین صورتِ حال ہے۔ تمام مسلمانوں کو اپنی اپنی استعداد اور سطح کے مطابق اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ دعا مانگنی چاہیے کہ عالم کا پروردگار اسلام اور مسلمانوں کو مسلمانوں کی بے تدبیریوں سے محفوظ رکھے۔

——— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۲۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ

(اِن سے کہہ دو) یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو[۳۴۴] اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہے اور (کہہ دو کہ) ہم تو ہر حال میں اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔ کہہ دو، کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو،[۳۴۵] دراں حالیکہ وہی ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی اور (اگر یہ نہیں، تو پھر)

۳۴۴ یعنی یہ رنگ کہ بغیر کسی تفریق اور تعصب کے اللہ کے تمام نبیوں اور تمام رسولوں کو مانا جائے۔ اس میں، اگر غور کیجیے تو یہود و نصاریٰ کے اصطباغ (بپتسمہ) کی طرف ایک تعریض بھی ہے۔ گویا انھیں یہ دعوت دی گئی ہے کہ رنگ چڑھانا ہے تو اللہ کی اس ہدایت کا رنگ چڑھاؤ۔ یہ پانی سے نہیں چڑھتا، بلکہ اس کی پرستش اور بغیر کسی تفریق و تعصب کے صرف اسی کی ہدایت پر ایمان لانے سے چڑھتا ہے۔

۳۴۵ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کسی ہدایت کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا تو گویا خود اللہ کے بارے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مُخْلِصُوْنَ ۔ ﴿۱۳۹﴾

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔ ﴿۱۴۰﴾

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا

ہمارے لیے ہمارا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا اور ہم تو خالص اُسی کے ہیں[۳۴۶]۔ ۱۳۸۔۱۳۹

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اُن کی اولاد کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے؟[۳۴۷] اِن سے پوچھو، تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟[۳۴۸] (افسوس)، اُن لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جن کے پاس اللہ کی کوئی گواہی ہو اور وہ اُسے چھپائیں۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ اُن چیزوں سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۱۴۰

یہ ایک گروہ تھا جو گزر گیا، اُن کا ہے جو اُنھوں نے کیا اور تمھارا ہے جو تم نے کیا، تم سے یہ نہ

میں جھگڑنا ہے۔ پھر کیا تم نے بات یہاں تک بڑھا دی ہے کہ اب ہمارے اور اپنے پروردگار کے بارے میں بھی ہم سے جھگڑو گے؟

۳۴۶ یعنی اب تم سے بحث بالکل لا حاصل ہے۔ جب تم یہاں تک پہنچ رہے ہو تو ہم کوئی بحث کرنے کے بجائے صرف اتنی بات کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ ہم تو خالص اپنے پروردگار ہی کے لیے ہیں، لہٰذا اس کی طرف سے جو ہدایت بھی آئے گی، بغیر کسی تردد کے اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔

۳۴۷ یہ اتمامِ حجت کے طور پر ایک مرتبہ پھر پوچھا ہے کہ کیا فی الواقع تم اتنی سنگین بات کہنے کی جسارت کر سکتے ہو؟

۳۴۸ یہ جملہ سرزنش کے اسلوب میں اور اس سے اگلا حسرت وافسوس کے انداز میں ہے۔ اس کے بعد بڑی سخت وعید کے طور پر فرمایا ہے کہ یہ شرارتیں جو جانتے بوجھتے تم کر رہے ہو، اللہ اِن سے بے خبر نہیں ہے،

یَعْمَلُوْنَ ۔﴿۱۴۱﴾

پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔[۳۴۹] ۱۴۱

ان کا نتیجہ اب بہت جلد تمھارے سامنے آ جائے گا۔

۳۴۹ یہ خاتمہء کلام میں ایک مرتبہ پھر وہی بات دہرائی ہے جو اوپر آیت ۱۳۴ میں کہی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تم سے تمھارے بزرگوں کا عمل نہیں پوچھا جائے گا، بلکہ تمھارا اپنا عمل پوچھا جائے گا۔ اس سارے سلسلہء بیان کا خلاصہ چونکہ یہی ہے، اس لیے اسی کو دہرا کر بات ختم کر دی ہے۔

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

نومولود اور شیطان

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۶۹۔۷۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عن إبى هريرة رضى الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ما من بنى آدم مولود إلا يمسه الشيطان حين يولد ـ فيستهل صارخا من الشيطان ، غير مريم و ابنها (عليهما الصلوٰة و السلام)۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدم کی اولاد میں کوئی جنم لینے والا ایسا نہیں ہے جسے شیطان اس کی پیدایش کے موقع پر تنگ نہ کرے۔ چنانچہ وہ شیطان کے چھونے سے چیخ چیخ کر رونے لگتا ہے، سوائے مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے کے۔''

لغوی مباحث

مس: یہ لفظ چھونے کے معنی میں آتا ہے۔ شیطان کے ساتھ نسبت میں اس میں شیطان کی ایذا رسانی کے معنی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

یستهل: بچے کا پیدایش کے موقع پر رونا۔

صارخا: بلند آواز سے چیخنا۔ یہ حال ہونے کی سبب سے منصوب ہے۔

متون

صاحبِ مشکوٰۃ نے یہ روایت حضرت مسیح اور حضرت مریم علیہما الصلوٰۃ والسلام کے استثنا پر ختم کر دی ہے۔ بخاری کی ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اس استثنا پر قرآنِ مجید کی آیت: 'وانی اعیذھا بك و ذریتها من الشیطان الرجیم'، (میں اسے اور اس کی ذریت کو (اے اللہ) آپ کی پناہ میں دیتی ہوں) (آلِ عمران ۳: ۳۶) سے استشہاد بھی روایت ہوا ہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرہ نے یہ آیت 'واقرء وا ان شئتم' (اگر چاہو تو پڑھو) کے الفاظ بول کر پڑھی ہے۔ باقی فرق محض لفظی ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم کی ایک روایت میں 'مس' اور 'یمس' کی جگہ پر اس کے ہم معنی الفاظ 'نخس' اور 'نخسة' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ بعض روایات میں 'مس' کی ایک دوسری صورت 'مسة' استعمال ہوئی ہے۔ یہ روایت بخاری، مسلم اور مسندِ احمد میں روایت ہوئی ہے۔ اور اس کے ہر متن میں مذکورہ آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ صاحبِ مشکوٰۃ نے اس حصے کو نقل نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ استشہاد کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے صاحبِ ''فتح الباری'' نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں شیطان کا طریقِ کار بیان ہوا ہے۔ یہ روایت بخاری میں ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن ابی ھریرة رضی اللّٰه عنه قال: قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: کل بنی آدم یطعن الشیطان فی جنبیه باصبعه حین یولد غیر عیسی بن مریم ذھب یطعن فطعن فی الحجاب.

(کتاب بدء الخلق، باب ۱۰)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام بنی آدم کو جب وہ پیدا ہوتے ہیں، شیطان ان کے پہلو میں اپنی انگلی سے کچوکا دیتا ہے۔ سوائے عیسیٰ بن مریم کے۔ وہ انھیں بھی کچوکا دینے گیا، مگر کچوکا ایک پردے میں دیا۔''

معنی

یہ روایت اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایک خبر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیدائش کے

موقع پر بچے کے رونے کا سبب کیا ہے۔ اس خبر کے درست یا غلط ہونے کا مدار روایت کی صحت پر ہے۔ بخاری و مسلم کے اس روایت کو منتخب کر لینے کی وجہ سے یہ ایک وقیع روایت ہے۔ لہٰذا اس میں جو خبر دی گئی ہے اسے درست ہی قرار دیا جائے گا۔ قرآنِ مجید میں نفیاً، اثباتاً، یا اشارۃً بھی اس ضمن میں کوئی بات بیان نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ اس روایت کے فہم یا مدعا کو متعین کرنے میں ہمیں قرآنِ مجید سے کوئی مدد نہیں ملتی۔

بچے کے رونے کا ظاہری سبب طبی ہے۔ اطبا کے مطابق بچے کے سانس کے عمل کا آغاز پھیپھڑوں کے کھلنے سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بچہ بلند آواز سے چیخے۔ جب بچہ چیختا ہے تو اس کے پھیپھڑے کھل جاتے ہیں اور تنفس کا عمل ہموار طریقے سے جاری ہو جاتا ہے۔ اطبا کی اس بات اور حدیث کے مفہوم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ انسان کے لیے جو چیز طبی لحاظ سے ناگزیر ہے، اس کو مہیا کرنے کے مرئی یا غیر مرئی اسباب کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔

اصل میں اس حدیث سے جس بات کا ابلاغ مقصود ہے، وہ شیطان کا عمل دخل ہے۔ اس روایت میں بتا دیا گیا ہے کہ انسان کے اس دنیا میں آتے ہی اس کا سابقہ شیاطین سے پڑ جاتا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شیطان کی انسان سے دشمنی کی شدت کیا ہے۔ ایک بچہ جو ابھی دنیا میں داخل ہوا ہے۔ جس کا ابھی اس خیر و شر کی کشمکش سے کوئی واسطہ نہیں ہے، شیطان اسے بھی نظر انداز نہیں کرتا اور اپنی دشمنی کا اظہار اسے جسمانی تکلیف دے کر کرتا ہے۔

قرآنِ مجید میں شیطان کی انسان سے دشمنی اور اسے گمراہ کرنے کا عزم پوری وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ یہ روایت اس دشمنی کے نقطۂ آغاز کا پتا دیتی ہے۔

اس روایت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کا استثنا بھی بیان ہوا ہے۔ یہ استثنا کس وجہ سے ہے؟ یہ نہ اس روایت سے واضح ہوتا ہے اور نہ اس روایت کے کسی اور متن میں اس کی وضاحت بیان ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی ایک خبر ہی کی حیثیت رکھتی ہے اور اس مجمل خبر کو جان لینے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس کے بارے میں مزید کوئی بات کہنے اور جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جس آیت سے اس استثنا کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ بڑی حد تک قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن آیت کا اصل مدعا اس خبر کی تصویب نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں حضرت مریم کی یہ دعا جس

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محل میں بیان ہوئی ہے، اس سے واضح ہے کہ ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور ان کی بچی اور نواسے کو شیطان کی دراندازیوں سے محفوظ کر دیا گیا، لیکن یہ بات واضح رہے کہ انھوں نے یہ دعا حضرت مریم علیہا السلام کی پیدایش کے بعد کی تھی۔ لہٰذا حضرت مریم کی پیدایش کے موقع کو اس آیت کی وجہ سے مستثنیٰ سمجھنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس روایت کا وہ متن زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے جس میں صرف عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا استثنا بیان ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پہلے دن ہی سے محفوظ ہونا اس لیے بھی درست ہے کہ انھیں گود ہی میں کلام کرنے کی اہلیت دی گئی تھی اور انھوں نے اپنے پیغمبر ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ قرآنِ مجید میں یہ بات پوری وضاحت سے بیان کی گئی ہے کہ جب کسی شخص پر وحی نازل کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو زمین آسمان میں اس حق کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ اہتمام بچپن ہی سے ہونا چاہیے۔ اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کو چونکہ ایک ایسے پیغمبر کی ماں بننا تھا، جو بن باپ کے پیدا ہو لہٰذا ان کی خصوصی حفاظت بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔

کتابیات

بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ۴۲۔ کتاب تفسیر القرآن، باب ۵۹۔ مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب ۴۰۔ مسند احمد، مسندِ ابی ہریرہ۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بچے کا رونا اور شیطان

عن أبی هريرة رضی الله عنه قال : قال رسول الله صلی الله عليه وسلم : صياح المولود حين يقع نزغة من الشيطان ۔

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بچے کے چیخنے کا باعث، جب بچا چیختا ہے، شیطان کا کچوکا ہے۔“

لغوی مباحث

نزغة : کچوکا، انگلی یا کسی نوکیلی چیز کو چبونا۔

متون

اس روایت کا یہی متن روایت ہوا ہے۔ اصل میں یہ پہلی روایت کے مضمون ہی کا مختصر بیان ہے۔

معنی

اس روایت کے متعدد پہلو ہم اوپر کی روایت کی شرح میں واضح کر چکے ہیں۔ یہاں صرف ایک پہلو کی توضیح پیشِ نظر ہے۔ ان روایات کے مطالعے سے یہ تاثر ہوسکتا ہے کہ انسان پیدا ہوتے ہی شیطان کے تسلط میں آ جاتا ہے۔ اس روایت کا مدعا یہ نہیں ہے۔ شیطان کی صلاحیت صرف وسوسہ اندازی تک محدود ہے۔ انسان اپنے ارادے سے اس وسوسے کو قبول کرتا اور شیطانی راستوں پر چل نکلتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

مسلم، کتاب الفضائل، باب ۶۵۔ تفصیلی مضمون کے لیے دیکھیے، ''کتابیات''، حدیثِ سابق۔

شیطان کے کارندے

عن جابر رضی اللّٰه عنه قال : قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم إن إبلیس یضع عرشه علی الماء۔ ثم یبعث سرایاه یفتنون الناس فأدناهم منه منزلة أعظمهم فتنة۔ یجئ أحدهم فیقول : فعلت کذا و کذا۔ فیقول : ما صنعت شیئا۔ قال : ثم یجئ أحدهم فیقول : ما ترکته حتی فرقت بینه و بین إمرأته۔ قال : فیدنیه منه۔ فیقول : نعم أنت۔ قال الأعمش : أراه۔ قال : فیلتزمه ۔

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: شیطان اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے۔ پھر وہ مہمات بھیجتا ہے جو لوگوں کو فتنوں میں ڈالتی ہیں۔ جو ان میں سب سے بڑا فتنہ پرداز ہوتا ہے وہ مرتبے میں اس کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک آتا ہے، پھر وہ بیان کرتا ہے: میں نے یوں اور یوں کیا۔ پھر وہ کہتا ہے: تم تو کچھ بھی نہیں کر سکے، پھر ایک اور آتا ہے، آ کر کہتا ہے: میں نے اسے نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ اس کے اور اس کی گھر والی کے مابین تفریق کرا دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ شیطان اسے اپنے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے تم کیا خوب ہو۔ اعمش کہتے کہ میرے خیال میں آپ نے فرمایا تھا: پھر وہ اسے لپٹا لیتا ہے۔''

لغوی مباحث

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عرش: صاحبِ اقتدار کی نشست۔

یفتنون: آزمایش میں ڈالتے ہیں۔

فرقت: تفریق کرا دیتے ہیں۔

نعم أنت: تم کیا خوب ہو۔

یلتزم: لپٹنا۔ چمٹ جانا۔

متون

اس روایت کا تفصیلی متن یہی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ باقی کتابوں میں فتنوں کی تفصیل بیان نہیں کی گئی۔ صرف یہ خبر دی گئی ہے کہ ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور اس کے ہاں بڑے مراتب اسے حاصل ہوتے ہیں جو انسانوں کے لیے سب سے بڑا فتنہ سامان ہوتا ہے۔

معنی

یہ روایت بھی ان اخبار میں سے ہے جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا گیا اور آپ نے اپنی امت کو باخبر کیا۔ اس روایت میں پہلی بات یہ واضح کی گئی ہے کہ شیطان اپنی فتنہ سامانیوں میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کا کارخانہ خود اس پر اور اس کے بہت سے کارندوں پر مشتمل ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ

شیطان کے یہ کارندے ہر ہر طرح کی برائیوں کی ترویج کی کوشش کرتے ہیں اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے بار بار وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ تیسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ مرغوب زوجین میں مناقشہ پیدا کرنا ہے۔ انسانی سماج کی خیر وفلاح کا انحصار گھر کے سکون پر ہے۔ اگر یہ سکون غارت ہو تو اس کے نتیجے میں صرف دو مرد وعورت ہی متاثر نہیں ہوتے، بلکہ ان کے بچے اور ان کے خاندان بھی مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سب سے برا نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل کی صحیح خطوط پر تربیت شدید طور پر متاثر ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ میاں بیوی کی مثال ایک نمایاں مثال کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے۔ شیطان کا ہدف تمام انسانی تعلقات ہیں۔ وہ ہر ہر رشتے کو توڑنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ بہنوں اور بھائیوں، والدین اور اولاد اور دوست اور دوست کے مابین بھی منافرت کے بیج بوتا رہتا ہے۔

اس سے ایک اور نکتہ بھی واضح ہوتا ہے۔ ان روابط کی درستی انسانی اخلاق کی درستی کی مرہون ہے۔ چنانچہ حقیقت میں اس کا اصل ہدف اخلاق کی بربادی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس لیے بیان کر دی ہے کہ ہر انسان اخلاق کے معاملے میں شیطان کی دراندازیوں پر متنبہ رہے۔

کتابیات

مسلم، کتاب صفۃ القیامہ والجنہ والنار، باب ۱۷۔ مسند احمد، مسند جابر بن عبداللہ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اہلِ عرب اور شیطان

عن جابر بن عبداللّٰه رضی اللّٰه عنه قال : قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم : إن الشیطان قد أیس من أن یعبده المصلون فی جزیرة العرب و لکن فی التحریش بینهم -

---

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان جزیرۂ عرب کے ان نمازیوں سے اپنی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے۔لیکن باہمی مناقشات میں وہ پرامید ہے۔''

لغوی مباحث

المصلون : یہ نمازی۔ یہ الف لام عہد کا ہے۔

التحریش : باہمی تفریق و دشمنی۔

متون

روایت کے متون زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ایک روایت میں 'فی التحریش' کے بعد 'بینھم' کا اضافہ روایت ہوا ہے۔مسلم کی ایک روایت کے سوا کسی روایت میں 'المصلون' کے ساتھ 'جزیرۃ العرب' کی تخصیص بیان نہیں ہوئی۔امام احمد نے اپنی کتاب میں یہ جملہ حج کے موقع پر آپ کے خطاب کے ایک جز کے طور پر بھی روایت کیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معنی

یہ روایت صحابہ ءکرام رضوان اللہ عنہم کے حوالے سے ایک عظیم الشان بشارت کو بیان کرتی ہے۔ یہاں شیطان کی عبادت سے شرک مراد ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا تصور جس طرح راسخ کر دیا تھا اور صحابہ ءکرام جس طرح اس پر جازم ہو گئے تھے، یہ خوش خبری اسی کامیابی کا نتیجہ ہے۔

اس روایت سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قیامت تک کے اہلِ عرب کو کوئی خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔ روایت میں 'المصلون' کا لفظ معرف باللام آیا ہے اور یہ لام عہد کا ہے۔ چنانچہ اس روایت میں صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست تربیت کردہ صحابہ ہی کو 'المصلون' قرار دیا گیا ہے۔

اس روایت میں ایک اندیشے کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ عقائد کے معاملے میں شیطان کا بس تم پر نہیں چلے گا۔لیکن تمھارے اندر پھوٹ ڈالنے کے معاملے میں اسے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بات کو بیان کرنے سے آپ کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرک و توحید کے معاملے میں تمھارے اندر ضروری حساسیت پیدا ہو گئی ۔ چنانچہ شیطان کی وسوسہ اندازی اس میں مؤثر نہیں ہو گی ۔لیکن

تفریق وانتشار کے معاملے میں تم اس کے فریب میں آ سکتے ہو۔ تمھیں اس معاملے میں بھی پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے۔

کتابیات

مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب ۱۷۔ ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ۲۵۔ مسند احمد، مسند انس بن مالک۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانونِ جہاد

(۴)

جذبۂ محرکہ

دوسری بات جو ان آیات سے واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس قتال کا حکم ان میں دیا گیا ہے، وہ نہ خواہشِ نفس کے لیے ہے، نہ مال و دولت کے لیے، نہ ملک کی تسخیر اور زمین کی حکومت کے لیے، نہ شہرت و ناموری کے لیے اور نہ حمیت و حمایت اور عصبیت یا عداوت کے کسی جذبے کی تسکین کے لیے۔ وہ، جس طرح کہ 'قاتلوا' کے بعد 'فی سبیل اللّٰہ' کی قید سے ظاہر ہے، محض اللہ کے لیے ہے۔ قرآن نے یہ بات حکم کی ابتدا ہی میں پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ انسان کی خود غرضی اور نفسانیت کا اس قتال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی جنگ ہے جو اُس کے بندے اس کے حکم پر اور اس کی ہدایت کے مطابق 'فی سبیل اللّٰہ' یعنی اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اُن کی حیثیت اس جنگ میں محض آلات و جوارح کی ہے۔ اس میں اُن کو اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی اس حیثیت سے سرِ مو کوئی انحراف نہیں کر سکتے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا. (۴:۷۶)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو منکر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا تم بھی شیطان کے ان دوستوں سے لڑو۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیطان کی چال ہر حال میں بودی ہوتی ہے۔''

قرآن کا یہ منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض مواقع پر نہایت خوبی کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔

ابوموسیٰ اشعری کا بیان ہے کہ ایک شخص حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ کوئی مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے، کوئی شہرت اور ناموری کے لیے لڑتا ہے، کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، فرمائیے کہ ان میں سے کس کی لڑائی اللہ کی راہ میں ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اللہ کی راہ میں لڑائی تو صرف اس کی ہے جو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے میدان میں اترے۔[10]

ابوامامہ باہلی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: اس شخص کے بارے میں فرمائیے جو مالی فائدے اور ناموری کے لیے جنگ کرتا ہے، اُسے کیا ملے گا؟ آپ نے جواب دیا: اُسے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اُس شخص نے تین مرتبہ یہی بات پوچھی اور آپ نے یہی جواب دیا، یہاں تک کہ فرمایا: اللہ تعالیٰ کوئی عمل بھی اُس وقت تک قبول نہیں کرتا، جب تک وہ خالص نہ ہو اور اُس کی رضامندی کے لیے نہ کیا جائے۔[11]

ابوہریرہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے آدمیوں کا فیصلہ ہوگا: پہلے اُس شخص کا جو لڑ کر شہید ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا۔ وہ اُن کا اقرار کرلے گا تو اللہ پوچھے گا: تو نے میرے لیے کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے تیرے لیے جنگ کی، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا، تو نے تو اس لیے جنگ کی تھی کہ لوگ تیری بہادری کا اعتراف کریں، سو یہ ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس کے لیے عذاب کا حکم فرمائے گا اور اُسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔[12]

عبادہ بن صامت بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلے اور اس میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی کی نیت بھی کر لی تو اسے صرف وہ رسی ملے گی۔ اس کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔[13]

معاذ بن جبل کا بیان ہے کہ ایک موقع پر آپ نے فرمایا: لڑائیاں دو قسم کی ہیں: جس نے خالص اللہ کی رضا جوئی کے لیے لڑائی کی اور اس میں اپنے حکمران کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا، اپنے ساتھیوں کے

---

[10] بخاری، رقم ۲۸۱۰۔

[11] نسائی، رقم ۳۱۴۰۔

[12] نسائی، رقم ۳۱۳۷۔

[13] نسائی، رقم ۳۱۳۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا اور فساد سے اجتناب کیا تو اس کا سونا جاگنا، سب باعثِ اجر ہوگا اور جس نے دنیا کو دکھانے اور شہرت اور ناموری کے لیے تلوار اٹھائی اور اس میں اپنے حکمران کی نافرمانی کی اور اس طرح زمین میں فساد پھیلایا تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا۔[14]

اس قتال کی یہی نوعیت ہے جس کی بنا پر اس کا اجر بھی نہایت غیر معمولی بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ. فَرِحِیۡنَ بِمَآ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ. یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ ، وَّ اَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ. (آل عمران ۳: ۱۶۹-۱۷۱)

’’اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انھیں مردہ خیال نہ کرو۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ اپنے پروردگار کے حضور میں زندہ ہیں، انھیں روزی مل رہی ہے، اللہ نے جو کچھ اپنے فضل میں سے انھیں دیا ہے، اُس پر شاداں وفرحاں ہیں اور اُن لوگوں کے بارے میں بشارت حاصل کر رہے ہیں جو اُن کے پیچھے رہ جانے والوں میں سے ابھی ان سے نہیں ملے کہ انھیں بھی نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل سے خوش وقت ہیں اور اس بات سے کہ اللہ اہل ایمان کا اجر ضائع نہ کرے گا۔‘‘

ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے ـــــ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے ـــــ اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دن کو روزے رکھتا رہے اور رات کو نماز میں کھڑا رہے، اور اللہ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے ذمہ لیا ہے کہ انھیں وفات دے گا تو سیدھا بہشت میں لے جائے گا، ورنہ اجر وثواب اور مالِ غنیمت دے کر سمتی کے ساتھ گھر لوٹا دے گا۔[15]

انھی کا بیان ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے کوئی ایسا عمل

۱۴؎ نسائی، رقم ۳۱۸۸۔

۱۵؎ بخاری، رقم ۲۷۸۷۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بتائیے جو اجر وثواب میں جہاد کے برابر ہو۔ آپ نے فرمایا: ایسا کوئی عمل نہیں ہے۔ پھر پوچھا: کیا یہ کر سکتے ہو کہ جب مجاہدین گھروں سے نکلیں تو مسجد میں جا کر برابر نماز میں کھڑے رہو، ذرا دم نہ لو اور برابر روزے رکھے جاؤ، کبھی افطار نہ کرو؟ اُس نے کہا: بھلا ایسا کون کر سکتا ہے۔[16]

یہی ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: بہشت میں سو درجے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیا ہے، ان میں سے ہر دو درجوں میں اتنا فاصلہ ہے، جتنا زمین وآسمان میں ہے۔[17]

انھی کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: اُس پروردگار کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ کی راہ میں جو شخص بھی زخمی ہوا ـــ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون فی الواقع اس کی راہ میں زخمی ہوا ہے ـــ وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ رنگ تو خون کا رنگ ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی۔[18]

ابن جبر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس بندے کے پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے، اسے دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں۔[19]

سہل بن سعد کہتے ہیں کہ آپ کا ارشاد ہے: دشمن سے حفاظت کے لیے سرحد پر ایک دن کا قیام دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہے۔[20]

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۶؎ بخاری، رقم ۲۷۸۵۔

۱۷؎ بخاری، رقم ۲۷۹۰۔

۱۸؎ بخاری، رقم ۲۸۰۳۔

۱۹؎ بخاری، رقم ۲۸۱۱۔

۲۰؎ بخاری، رقم ۲۸۹۲۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور علوم نبوت

(۲)

ایک اصولی ضابطہ

ہم نے روافض اور شیعہ راویوں کی راویت اس لیے رد کی ہے کہ اصولِ حدیث کی رو سے راوی میں طعن کا چوتھا سبب ''بدعت'' ہے اور بدعت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ بدعت جو باعثِ تکفیر ہو، ایسے بدعتی راوی کی روایت مردود ہوتی ہے اور ناقابلِ استناد، اس پر علما کا اتفاق ہے: 'من کفر ببدعته لم یحتج به بالاتفاق[۵۲]'۔

شریعت کے متواتر اور مشہورِ عام حکم کے انکار یا اس کے خلاف اعتقاد پر تکفیر کا حکم ہوگا: 'فالمعتمد ان الذی تردّ روایته من انکر أمراً متواتراً من الشرع معلوماً من الدین بالضرورة و کذا من اعتقد عکسه[۵۳]'۔

۲۔ ایسی بدعت جو باعثِ فسق ہو، ایسے راوی کی روایت دو شرطوں کے ساتھ مقبول ہوگی:

(الف) راوی اپنی بدعت کی طرف داعی نہ ہو۔ 'یحتج به ان لم یکن داعیة الی بدعته ، ولا یحتج به ان کان داعیة[۵۴]'۔

(ب) اپنی بدعت کی موید اور اس کو رواج دینے والی کسی چیز کی روایت نہ کرے۔ 'و منهم زائغ عن

---

۵۲ تقریب النووی مع تدریب الراوی ۱: ۳۲۴۔

۵۳ شرح نخبۃ الفکر ص ۱۰۱۔

۵۴ تقریب النووی مع التدریب ۱: ۳۲۵۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الحق ، صدوق اللهجة ، قد جرى فی الناس حدیثه، اذ کان مخذولاً فی بدعته ، مأمونا فی روایته ، فهولا عندی لیس فیهم حیلة الا ان یؤخذمن حدیثهم ما یعرف اذ لم یقویه بدعته فیتهم عند ذلك[۵۵]۔'

حافظ ابنِ حجر عسقلانی اسے مذہبِ مختار قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو''شرح نخبۃ الفکر مع الشرح'' از مصنف ص:۱۰۳۔

مرسل روایتیں

اس سلسلے میں درج بالا مرفوع روایات کے علاوہ کچھ مرسل روایتیں بھی موجود ہیں۔ ان کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل مرسل کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

''مرسل'' لغت میں ''ارسل'' سے اسمِ مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنی آزاد چھوڑنے کے ہیں۔ اصطلاح میں مرسل وہ روایت ہے جس کی سند کا آخری حصہ (تابعی کے بعد) بیان نہ کیا گیا ہو[۵۶]۔

یعنی تابعی 'قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم' کہے اور حدیث بیان کرے۔ خواہ تابعی بڑے رتبے کا ہو یا معمولی درجے کا[۵۷]۔

اس سے معلوم ہوا کہ مرسل ایسی روایت ہے جس کا بیان کرنے والا زمانہء وقوع میں موجود نہیں تھا اور اسی بنیاد پر اس کی حجیت کی بحث چل پڑی۔ محققین کے نزدیک مرسل روایت حجت نہیں۔

حدیثِ نبوی کے حفاظ و نقاد کی آخری و حتمی رائے یہی ہے اور اسی فیصلے کو انھوں نے اپنی تصانیف میں درج کیا ہے۔ علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں: 'وما ذکرنا ہ من سقوط الاحتجاج بالمرسل والحکم بضعفه هوالمذهب الذی استقر علیه آراء جماهیر حفاظ الحدیث و نقاد الاثروتداولوه فی تصانیفه[۵۸]۔'

---

[۵۵] احوال الرجال از جوزجانی، ص۳۲۔

[۵۶] مقدمہ ابن الصلاح، ص۷۰۔۷۱، نوع ۹۔

[۵۷] شرح نخبۃ الفکر، ص۶۶۔۶۷؛ النکت علی کتاب ابن الصلاح ۲: ۵۴۳۔۵۴۴۔

[۵۸] مقدمہ ابن الصلاح، ص۷۳۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امام مسلم فرماتے ہیں: 'المرسل من الروایات فی اصل قولنا و قول اھل العلم بالاخبار لیس بحجة[59]'۔

حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں: 'المرسل ضعیف لاحجة فیه[60]'۔

مرسل کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر معروف راوی کو حذف کیا جاتا ہے جو غیر ثقہ بھی ہوسکتا ہے[61]۔ البتہ اکثر علما مراسیلِ صحابہ کو ضعیف نہیں سمجھتے، بلکہ یہ موصول کے حکم میں ہوتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ، صحابہ سے روایت کرتے ہیں اور سب صحابہ عادل ہیں، پس ان کی جہالت مضر نہیں[62]۔

اس سلسلے کی مرسل روایتیں

۱۔ صحیح بخاری میں ہے: 'عن ابی هریره رضی الله عنه قال : بعثنی ابوبکر رضی الله عنه فی موذنین بعثهم یوم النحر یوذنون بمنی ان لایحج بعد العام مشرك ولا یطوف بالبیت عریان، قال حمید بن عبد الرحمن : ثم اردف رسول الله صلی الله علیه وسلم بعلی بن ابی طالب وامره ان یوذن ببراءةٍ ، قال ابوهریره : فاذن معنا علی یوم النحر فی اهل منی ببراءةٍ و ان لایحج بعد العام مشرك ولا یطوف بالبیت عریان[63]۔'

اس حدیث میں آپ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ:

۱۔(ثم اردف) علی رضی اللہ عنہ کا سورۂ برائت کے ساتھ بھیجنا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے کلام میں موجود نہیں بلکہ یہ حمید بن عبدالرحمٰن کا قول ہے جو ایک تابعی ہیں، اس لیے حافظ ابنِ حجر کو تسلیم ہے کہ: 'هذا القدر من الحدیث مرسل ، لان حمیداً لم یدرك ذلك ، ولاصرح بسماعه له من ابی هریرة رضی الله عنه[64]' یعنی: روایت کا یہ حصہ مرسل ہے کیونکہ حمید بن عبدالرحمٰن جیسے اس واقعے کے

---

[59] صحیح مسلم مطبوعہ استنبول ۱:۳۰ مقدمہ، باب (۶)۔

[60] فتح الباری ۱:۲۵۱؛ ۲:۱۷۵؛ ۵:۱۹۰؛ ۱۱:۲۶۷۔

[61] الباعث الحثیث، حاشیہ از احمد محمد شاکر، ص ۵۸۔

[62] مقدمہ ابن الصلاح، ص ۵۷؛ الباعث الحثیث از حافظ ابنِ کثیر، ص ۵۸۔

[63] صحیح بخاری (۴۶۵۵) کتاب التفسیر (۶۵) تفسیر سورۂ برائت۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوران میں موجود نہ تھا، اسی طرح اس نے اس ٹکڑے کو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سننے کی تصریح بھی نہیں کی۔

۲۔ اس روایت میں 'لا یبلغه الا انا ...... آہ' کے الفاظ بھی سرے سے موجود نہیں۔

(۲) اس قسم کی ایک مرسل روایت سیرۃ ابنِ ہشام ۴: ۱۹۰ میں محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب ابوجعفر الباقر سے ان الفاظ میں منقول ہے کہ: 'لا یودی عنی الا رجل من اهل بیتی'۔

اسی سند کے بارے میں حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں: 'اسناده مرسل'[۶۵]۔

(۳) ایک مرسل روایت زید بن یُثیع سے منقول ہے[۶۶]: زید کوفی ہے اور ثقہ تابعی ہے[۶۷]۔ اس سے روایت کرنے والا صرف ابواسحاق السبیعی ہے[۶۸]۔ ابواسحاق السبیعی تدلیس کیا کرتا تھا[۶۹]۔ اس کی یہ روایت معنعن ہے، پس اصولِ حدیث کے مطابق یہ روایت مردود ہے۔

(۴) ایک مرسل روایت ابوجعفر الباقر سے مفسر ابن جریر نے نقل کی ہے[۷۰]۔ مرسل ہونے کے ساتھ اس میں درجِ ذیل خامیاں ہیں:

۱۔ اس کا ایک راوی محمد بن حمید رازی ہے جس کے بارے میں محدث اسحاق بن منصور فرماتے ہیں: میں اللہ تعالیٰ کے سامنے گواہی دوں گا کہ محمد بن حمید کذاب تھا[۷۱]۔ امام جوزجانی لکھتے ہیں: بدمذہب اور غیر ثقہ تھا[۷۲]۔

۲۔ ایک راوی سلمہ بن الفضل بن الابرش ہے جس کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں کہ: 'عنده

۶۴۔ فتح الباری ۸: ۳۱۸۔

۶۵۔ فتح الباری ۸: ۸۳۔

۶۶۔ تفسیر ابنِ جریر ۶: ۳۰۶ (۱۶۳۸۶)، (۱۶۳۸۷)۔

۶۷۔ تاریخ الثقات للعجلی، ص ۱۷۲، ترجمہ ۴۹۳۔

۶۸۔ تہذیب الکمال ۱۰: ۱۱۶۔

۶۹۔ تعریف اہل التقدیس، ص ۱۰۱، ترجمہ ۹۱۔

۷۰۔ تفسیر ابنِ جریر ۶: ۳۰۷ (۱۶۳۹۱)۔

۷۱۔ تاریخِ بغداد ۲: ۲۶۳۔

۷۲۔ احوال الرجال للجوزجانی، ص ۲۰۷، ترجمہ: ۳۸۲۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مناکیر۔[3]

جبکہ امام یحییٰ بن سعید القطان امام بخاری سے نقل کرتے ہیں: جس راوی کے متعلق میں منکر الحدیث استعمال کروں تو اس سے روایت لینی ناجائز ہے۔[4]

امام علی بن المدینی لکھتے ہیں: ری سے نکلنے سے پہلے پہلے ہم نے ان کی رویات کو اپنے سے پرے پھینکا تھا۔[5]

۳:۔ایک راوی محمد بن اسحاق صاحب المغازی ہے، جو بدترین تدلیس کا شکار تھا اور ہمیشہ ایسے راویوں کے بارے میں تدلیس سے کام لیتا تھا جو ضعیف اور مجہول ہوا کرتے تھے۔[6] اس کی یہ روایت معنعن بھی ہے، پس روایت مردود ہوئی۔

(۵) مفسر ابنِ جریر نے ایک روایت اس سند کے ساتھ نقل کی ہے: 'حدثنی محمد بن الحسین قال حدثنا احمد بن المفضل، قال حدثنا اسباط عن السدِی قال لما نزلت ...... آہ'۔[7]

اس میں بھی کئی اسنادی خرابیاں ہیں:

ا۔ابنِ جریر کے استاذ محمد بن الحسین بن ابی الحنین الحنینی کے متعلق مجھے کتب اسماء رجال میں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ثقہ تھے یا غیر ثقہ۔

۲۔ اس کا ایک روای احمد بن المفضل الحفری الکوفی ہے جو روساءِ شیعہ میں سے تھا۔[8]

۳:۔ایک راوی اسباط بن نصر ہمدانی ہے، اس کی روایتیں پایہء اعتبار سے ساقط اور مقلوب الاسانید ہوتی ہیں۔[9]

۳؎ التاریخ الکبیر۴:۸۴، ترجمہ۲۰۴۴۔

۴؎ میزان الاعتدال۱:۶؛ لسان المیزان ۱:۲۰۔

۵؎ التاریخ الصغیر۲:۲۴۵؛ تہذیب الکمال۱۱:۳۰۶۔

۶؎ تعریف اھل التقدیس، ص۱۳۲، ترجمہ۱۲۵۔

۷؎ تفسیر ابنِ جریر۶:۳۰۷(۱۶۳۹۲)۔

۸؎ الجرح والتعدیل۲:۷۷؛ تہذیب الکمال۱:۴۸۷۔

۹؎ الجرح والتعدیل۲:۳۳۲؛ تہذیب الکمال۲:۳۵۸۔

۴۔ آخری راوی السدّی ہے، جس کا نام محمد بن مروان تھا اور جھوٹ بولنے سے متہم (بدنام) تھا۔[۸۰]
حافظ صالح بن محمد البغدادی فرماتے ہیں: احادیث وضع کیا کرتا تھا۔[۸۱] امام ابوحاتم رازی لکھتے ہیں کہ ذاہب الحدیث اور متروک الحدیث ہے اس کی روایت نہ لکھی جائے۔[۸۲]

مولانا محترم آگے فرماتے ہیں:

''اور جب مالِ غنیمت کے خمس میں سے ایک لونڈی آپ کے حصے میں آئی اور اس کے بارے میں لوگوں میں قیل وقال شروع ہوگئی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پاسِ غیرت کی بنا پر لوگوں کو ایذا رسانی سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا: '' هو منی وانا منه '' (تم نے علی رضی اللہ عنہ کو کیا سمجھا ہے) وہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔[۸۳]''

مجھے تلاش بسیار کے باوجود ُھو منی وانا منه ' کے الفاظ نہ مل سکے۔ البتہ صحیح روایت میں ''انت منی وانا منك'' کے الفاظ مسطورہ بالا واقعہ کے بغیر ملتے ہیں۔[۸۴]

لیکن اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی الفاظ اشعریین اور سیدنا جلیبیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں استعمال کیے ہیں:

عن ابی موسی الاشعری رضی الله عنه قال : قال النبی صلی الله علیه وسلم : ان الاشعریین اذا ارملوا فی الغزو اوقل طعام عیالهم بالمدینة جمعوا ماکان عندهم فی ثوب واحد ، ثم اقتسموه فی اناء واحدٍ بالسویةً ،	''اشعریوں کو جب کسی غزوہ کے دوران میں غلے کی کمی کا سامنا کرنا پڑے یا مدینہ میں کہیں ان کے اہل وعیال کو قلتِ طعام سے واسطہ پڑے تو وہ سب اپنا سارا غلہ ایک جگہ کر لیتے ہیں، پھر اسے سب کو برابر برابر بانٹ دیتے ہیں، پس وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔''

۸۰۔ تقریب التہذیب، ص۸۰۔
۸۱۔ تاریخِ بغداد ۳: ۳۹۲۔۳۹۳؛ تہذیب الکمال ۲۶: ۳۹۳۔
۸۲۔ الجرح والتعدیل ۸: ۸۶، ترجمہ: ۳۶۴۔
۸۳۔ ماہنامہ ''فکر ونظر'' اسلام آباد، ص۸۷، فضیلت (۶۱)۔
۸۴۔ صحیح بخاری (۲۶۹۹) کتاب الصلح (۵۳) باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان بن فلان (۶)؛ السنن البری للنسائی (۸۴۵۶) کتاب الخصائص (۷۷) باب (۲۲)؛ جامع الترمذی (۳۷۱۶) کتاب المناقب (۵۰) باب (۲۱)۔

فهم منی وانا منهم [۸۵]۔

۲۔ سیدنا جلیبیب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی غزوہ میں شریک تھے کہ مالِ غنیمت آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"هل تفقدون من احد ؟ قالوا : لا ، قال : لكنى افقد جليبيبا فاطلبوه، فطلب فى القتلى ، فوجدوه الى جنب سبعة قد قتلهم ثم قتلوه . فاتى النبى صلى الله عليه وسلم فوقف عليه فقال : قتل سبعة ثم قتلوه ، هذا منى وانا منه ، هذا منى وانا منه ، هذا منى و انا منه ، قال : فوضعه على ساعديه ، ليس له الا ساعدا النبى صلى الله عليه وسلم ، قال : فحفرله ، ووضع فى قبره ، ولم يذكر غسلاً [۸۶] ۔

''دیکھو کون کون لوگ لا پتا ہیں، لوگوں نے چند آدمیوں کے نام گنائے، آپ نے فرمایا: میں جلیبیب کو گم پاتا ہوں۔ مسلمان ان کی تلاش میں نکلے تو دیکھا کہ سات آدمیوں کے پہلو میں مقتول پڑے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی اور لاش کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا: سات کو قتل کر کے قتل ہوا۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور جلبیب کی لاش کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر لائے اور قبر کھدوا کر دفن کیا اور غسل نہیں دیا۔''

(جاری)

---

۸۵ صحیح بخاری (۲۴۸۶) کتاب الشرکۃ (۴۷) باب الشرکۃ فی الطعام والنھد والعروض؛ صحیح مسلم (۲۵۰۰) کتاب فضائل الصحابہ (۴۴) باب من فضائل الاشعریین (۳۹)

۸۶ صحیح مسلم (۲۴۷۲) کتاب فضائل الصحابہ (۴۴) باب من فضائل جلیبیب (۲۷)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قارئینِ ''اشراق'' کے خطوط و

سوالات پر مبنی جوابات کا سلسلہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شئیر ز کا کاروبار

سوال: شئیر ز کا کاروبار جائز ہے یا نہیں؟ ان میں نفع اور نقصان دونوں ہیں۔

(ڈاکٹر اکبر میمن، حیدر آباد)

جواب: شئیر ز کا کاروبار اپنی سادہ صورت میں بالکل جائز ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کی بعض ایسی صورتیں ہیں جو جوئے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ان سے بچتے ہوئے اگر یہ کاروبار کیا جائے تو اس میں حرج نہیں۔

(طالب محسن)

قرض کا استعمال

سوال: کوئی آدمی مجھ سے قرض لے اور اسے شئیر ز کا کاروبار کرے تو اس کا وبال میرے اوپر ہو گا؟ (ڈاکٹر اکبر میمن، حیدر آباد)

جواب: کوئی آدمی قرض لے کر کہاں خرچ کرے گا، اس کا تعلق قرض دینے والے سے اصلاً نہیں ہے۔

البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ قرضہ لینے والا کسی غلط کام کے لیے قرض لے رہا ہے تو پھر معذرت کر لینی چاہیے۔ شیرز کا کاروبار کرنے کے معاملے میں آپ اگر اپنے قرض دار کو درست کاروباری مانتے ہیں تو آپ پر کوئی وبال نہیں۔ چھوٹی موٹی غلطی اگر اس سے ہوتی ہے تو اسی کے کھاتے میں ڈالی جائے گی۔ (طالب محسن)

صبر

سوال: صبر کی حد کیا ہے؟ (ایم ناصر امین، بہاول پور)

جواب: صبر اصل میں زندگی بھر کا عمل ہے۔ اصلاً آدمی کو صبر کے رویے پر قائم رہنا چاہیے، لیکن اگر کبھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو معافی اور درگزر کی امید ہے۔ (طالب محسن)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ختم نبوت کی توجیہات

سوال: ختم نبوت کی بابت دو توجیہات کی جاتی ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک خدائی دین کی عمارت تعمیر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ کر بالکل مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد ہدایت، دین اور علمِ حق میں سے کوئی چیز ایسی باقی نہ رہی جسے ظاہر کرنے کے لیے کسی اور نبی یا رسول کے آنے کی حاجت ہو۔

۲۔ دوسری یہ کہ ابتدا میں انبیا انسانوں کی صرف دینی معاملات ہی میں رہنمائی نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ طبعی علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں بھی انسانوں کو علم دیا کرتے تھے۔ پھر جوں جوں انسان ان علوم وفنون میں خود کفیل ہوتا چلا گیا، ان دنیوی علوم کی تعلیم انبیا کے منشور سے خارج ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ نبوت بتدریج صرف عبادات، عقائد اور سماجی احکام تک محدود ہو گئی۔ اس کے

بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ پر نبوت ختم ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اب ارتقا کی اس منزل کو پہنچ چکا ہے کہ سوائے عقائد و عبادات کے، باقی تمام معاملاتِ زندگی وہ خود طے کر سکے۔ اب انسان اپنے لیے سماجی، تمدنی، معاشی اور سیاسی نظام بھی اسی طرح مرتب کر سکتا ہے جس طرح وہ طب، زراعت، صنعت سازی اور دیگر نئے علوم کو چلاتا رہا۔ انسان کے پاس اب ایک نظامِ زندگی مرتب کرنے کے لیے ایک طرف تو آسمانی صحائف کی تعلیمات ہیں اور دوسری طرف اس کے پاس صدیوں کے تجربات ہیں جبکہ تیسری طرف سائنسی ترقی انسان کے علم و وسائل میں معتد بہ اضافہ کر چکی ہے۔ لہٰذا اب معاشی، سماجی اور سیاسی امور میں بھی، طبعی اور فنی امور کی طرح، انسان کی رہنمائی کے لیے نبوت کی حاجت نہیں رہی۔

خلافت فی الارض کا منشا بھی دراصل یہ ہے کہ انسان اپنے معاملات اور اس دنیا کا انتظام اور انصرام بتدریج خود سنبھالے۔ پس جب تک انسانیت اپنے بچپن اور ناپختگی کے دور میں رہی، انبیا آ آ کر شفیق والدین کی طرح اسے انگلی پکڑ کر چلاتے رہے اور جب انسانیت پختگی اور شعور کی منزل کو پہنچ گئی تو انبیا کی آمد کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ان دونوں توجیہات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ اور کیا ان دونوں کے اشتراک سے ایک زیادہ متوازن اور معتدل مسلک وجود میں آ سکتا ہے؟

۳۔ مولانا وحید الدین خاں اپنی کتاب ''ظہورِ اسلام'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن میں کہا گیا ہے کہ آج منکرین تمھارے دین کی طرف سے ناامید ہو گئے۔ اس لیے تم ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔ (المائدہ ۵: ۳) اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام سے پہلے جو دین آئے وہ ناقص دین تھے اور اسلام مکمل دین ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کے پاس کبھی کوئی ناقص دین نہیں بھیجا۔ اسلام کے کامل ہونے کا تعلق اس کی حفاظت سے ہے نہ کہ فہرستِ کلام سے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب دین کو اپنی صحیح شکل میں اتارنے کے ساتھ مزید تکمیلی اہتمام کیا گیا ہے کہ اس کی پشت پر قوت بھی جمع کر دی گئی ہے تاکہ کوئی منکر یا غیر منکر اس کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہی بات دوسری جگہ ان لفظوں میں کہی گئی ہے: 'اور تیرے رب کا کلام پورا ہو گیا۔ صداقت اور انصاف میں۔ اب کوئی اس کلام کو بدلنے والا نہیں (الانعام ۶: ۱۱۵)'' (ص ۶)

مولانا کی اس بات کے بارے میں بھی آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں؟ (عرفان محمود، اٹک)

جواب: آپ نے ختمِ نبوت کے جواز کے حوالے سے کچھ آرا رقم کی ہیں اور ان کے متعلق میری رائے جاننا چاہی ہے۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ مجھے مولانا وحید الدین کی اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ کوئی دین بھی ناقص دین نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر اپنی ہدایت بے کم و کاست نازل کی ہے۔ چنانچہ وہ تمام مذاہب جن کی بنیاد وحیِ الٰہی، یعنی آسمانی کتابوں پر ہے، اپنی تعلیمات میں بالکل یکساں ہیں۔ فرق صرف بعض مظاہر اور شرعی احکام میں ہے۔ یہ فرق بھی زمانے کے معاشی اور سماجی حالات کی وجہ سے ہے۔ اور اس فرق کی بنا پر اسلام میں بھی فتاویٰ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ اس کا تکمیل و عدم تکمیل سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ مجھے ان کی یہ بات درست نہیں لگتی کہ تکمیلِ دین کی آیت سے حفاظتِ دین مراد ہے۔ میرے خیال میں یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے دین کی تکمیل کو بیان کر رہی ہے۔ نہ اس کا حفاظت سے کوئی تعلق ہے اور نہ سابقہ ادیان کے مقابلے میں اس دین کے مکمل ہونے کو بیان کرنا متکلم کے پیشِ نظر ہے۔

آپ کا بیان کردہ یہ نکتہ بھی محلِ نظر ہے کہ تمام انبیا دین کی تکمیل کے مراحل کا حصہ ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اصل دین ہمیشہ ایک رہا، البتہ شرعی احکام یا تعمیلی مظاہر کے بعض اجزا حسبِ ضرورت مختلف رہے۔

البتہ آپ کے بیان کردہ دوسرے نکتے میں بعض چیزیں لائقِ تحسین ہیں۔ مثلاً ختمِ نبوت کے لیے یہ دلیل کہ اب تمدن کا ارتقائی عمل ایک خاص جگہ پر پہنچ گیا ہے لہٰذا دین کی تعلیمات کی حفاظت کے لیے موزوں حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح عملی اور سماجی ضروریات میں بھی اب کسی بڑے تغیر کے آنے کا کوئی امکان نہیں لہٰذا اب نئی نبوت کی ضرورت نہیں۔ ہمارے نزدیک، اصل وجہ صرف یہ ہے کہ اب ایک ہی پیغمبر کی تعلیمات ساری دنیا کے لیے اتمامِ حجت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ (طالب محسن)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وکالت

سوال: کیا وکالت کا پیشہ اسلامی ہے اور اس کی کمائی بھی اسلامی ہے؟ (ایم ناصر امین، بہاول پور)

جواب: وکیل کا اصل کام عدالت کو صحیح بات تک پہنچنے میں مدد دینا اور اپنے مؤکل کی قانونی معاونت کرنا

ہے۔اس اعتبار سے اس پیشے میں کوئی قباحت نہیں۔لیکن ہمارے ہاں وکلا بالعموم غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط ثابت کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی۔اگر وکیل اپنا اصل کردار ادا کریں تو وہ خود بھی ایک کارِخیر انجام دیں گے اوران کی آمدنی بھی جائز ہوگی۔(طالب محسن)

احسان

سوال: حضرت علی کا قول ہے کہ جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔اس سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ کیا کسی پر احسان نہ کیا جائے؟(ایم ناصر امین، بہاول پور)

جواب: میرا خیال ہے کہ حضرت علی احسان کے بعد دل میں پیدا ہونے والے عجب، دوسرے سے احسان مندی کی توقع اور اپنی برتری کے خیال کی ضرررسانیوں پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چیزیں بطورِ خاص اس صورت میں اور نقصان دہ ہو جاتی ہیں جب دوسرا غلط رویہ اختیار کرتا ہے۔اس کا یہ مطلب بہرحال نہیں ہے کہ دوسرے پر احسان نہ کیا جائے۔(طالب محسن)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

علما کا بیت المال

سوال: ایک رائے یہ پائی جاتی ہے کہ دین کے نام پر رقم اکٹھی کرنے کا حق صرف حکمرانوں کو حاصل ہے۔اللہ کے رسول بھی حکمران بننے کے بعد ہی بیت المال قائم کرتے ہیں۔اوراس بیت المال سے غریبوں کی کفالت کرتے ہیں۔مگر آج کل علما امیر لوگوں سے مراعات حاصل کر کے اپنا معیارِ زندگی بڑھا لیتے ہیں اوراس مال کو غریبوں تک پہنچنے کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔جو علما چندہ مانگے بغیر دین کا کام کر رہے ہیں ان کا کام نبیوں کے طریقے پر ہے اور جو علما لوگوں سے چندہ لے کر دین کا کام کر رہے ہیں وہ دراصل کاروبار کر رہے ہیں؟

اس معاملے میں آپ کا موقف کیا ہے؟

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے یہ استشہاد درست نہیں ہے کہ آپ چندہ نہیں لیتے تھے۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاروبار بند ہو جانے کے بعد آپ کے گھریلو اخراجات کی ذمہ داری بڑی حد تک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اٹھائے رکھی۔ مکے میں اپنے دعوتی کام کے لیے آپ نے دارارقم کی پیش کش قبول کی اور اسے استعمال کیا۔ باقاعدہ بیت المال کا نہ ہونا محض اتفاقی امر ہے۔ (طالب محسن)

مقروض کی زکوٰۃ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال: ایک شخص مقروض ہے۔ اس کے گھر میں نصاب سے کچھ زیادہ وزن کا زیور موجود ہے جو عموماً عورتوں کے پاس ہوتا ہے اور اُن کے زیر استعمال رہتا ہے۔ ملکیت کے اعتبار سے وہ زیور مخصوص نہیں ہے جیسا کہ گھروں میں عام رواج ہے۔ اس زیور پر زکوٰۃ دینا ہوگی؟

(محمد بلال، مظفر گڑھ)

جواب: قرض لیے ہوئے مال کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ فنا ہو چکا، یعنی خرچ ہو چکا ہے اور دوسری یہ کہ وہ کسی اثاثے کی شکل میں موجود ہے۔

پہلی صورت میں قرض کی رقم آپ اپنے مجموعی قابلِ زکوٰۃ اثاثوں سے منہا کر کے زکوٰۃ ادا کریں گے اور دوسری صورت میں آپ قرض سے بنے ہوئے اثاثے کے سوا قابلِ زکوٰۃ اثاثوں پر زکوٰۃ ادا کریں گے۔

(محمد رفیع مفتی)

جہنم کی سزا اور انسان کا اپنی مرضی سے پیدا ہونا

سوال: اللہ نے انسان کو خود ہی پیدا فرمایا۔ وہ خود اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوا۔ دنیا کی تھوڑی سی

زندگی کے امتحان کے بدلے (اگر وہ فیل ہو گیا) تو آیندہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جلنا کیا انصاف کے خلاف نہیں ہے؟ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اگر اتنی لامحدود سزا دینا تھی تو اس سے بہتر تھا کہ پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔ میں نے کب پیدا ہونے کا مطالبہ کیا تھا؟ (محمد بلال، مظفر گڑھ)

جواب: جرم کی سزا دراصل، اُس کی شناعت اور اُس کی سنگینی کی بنا پر ہوا کرتی ہے، نہ کہ مدتِ جرم کی بنا پر۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ مدتِ جرم بھی جرم کی سنگینی میں اضافے کا باعث ہوتی ہے، لیکن جرم کی سنگینی کی واحد وجہ اُس کی مدت نہیں ہوتی۔ بعض جرم چند لمحوں کے ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنے بے پناہ اثرات چھوڑتے ہیں۔ مثلاً کسی کو قتل کرنے کا جرم۔ چنانچہ اصل مسئلہ جرم کی شناعت کا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے شفیق اور مہربان والدین کو قتل کر دیتا ہے، تو آپ بتائیے کہ اُس کے جرم کی سنگینی کس درجے کی ہے۔

ایک دوسرے پہلو پر غور کریں۔ نیکی کے بدلے میں نیکی کی جائے تو یہ خوبی ہے، لیکن اگر وفا کے بدلے میں بے وفائی کی جائے، ایثار کے بدلے میں لُوٹ لیا جائے، خدمت کرنے کے بدلے میں بے گار لی جائے، محبت کرنے کے بدلے میں دشمنی کی جائے تو یہ سراسر ظلم ہوگا، بہت بڑا ظلم۔

خدا انسان کا خالق بھی ہے اور رب بھی، اُس کا منعم بھی ہے اور محسن بھی۔ انسان محض اور محض خدا کے ترس پر کھڑا ہے، انسان کے ساتھ خدا کا رویہ انتہائی احسان کرنے والے کا ہے۔ اُس کے ساتھ انسان کا معاملہ برابر کا نہیں ہے۔ انسان خدا کے بل بوتے پر قائم ہے اور ہر لحاظ سے اس کا محتاج ہے۔ چنانچہ پھر انسان کی طرف سے اُس کے اتنے اچھے اور اُس کی زندگی میں اتنی اہمیت رکھنے والے خدا کے ساتھ، ایک لمحے کی سرکشی بھی اپنے اندر لامحدود سنگینی رکھتی ہے۔ اِس لیے کہ یہ مخلوق کی اپنے خالق کے ساتھ سرکشی ہے۔ یہ بندے کی اپنے رب کے ساتھ سرکشی ہے، یہ عبد کی اپنے معبود کے ساتھ سرکشی ہے۔ یہ انسان کی رحمٰن کے ساتھ سرکشی ہے۔ اِس جرم کی شناعت ماپی ہی نہیں جا سکتی۔ اور پھر مزید یہ کہ انسان جب فی الواقع مجرم بن کر جرم کرتا ہے تو اُس کی اپنی جانب سے جرم زماں و مکاں کی حدوں میں محدود نہیں ہوا کرتا۔ فرعون نے اپنے ارادے اور اپنی نیت کے اعتبار سے کسی محدود وقت تک کے لیے فرعونیت اختیار نہیں کی تھی اور اپنی طرف سے اُس نے اپنی فرعونیت کا دائرہ صرف ملکِ مصر تک محدود نہیں کیا تھا۔ اُسے خدا نے جتنا موقع دیا تھا، اُس میں اُس نے فرعون ہی بن کر دکھایا اور جتنا علاقہ دیا، اُس سب میں اُس نے فرعون ہی بن کر دکھایا تھا۔ خدا اگر اُس کے لیے مواقع اور علاقے کو لامحدود کر دیتا تو کیا خیال ہے کہ ہم اُسے آج ایک مہربان بادشاہ کے طور پر دیکھ رہے ہوتے، نہیں بالکل نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دین ہمیں بتاتا ہے کہ جہنم میں صرف اور صرف سرکش لوگ ہی ڈالے جائیں گے اور یہ بات واضح رہے کہ خدا سے سرکشی اپنی اصل ہی میں زماں و مکاں سے بالا ایک لامحدود جرم ہوتا ہے۔

اب میں آپ کے سوال کے دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں کہ خود انسان نے تو خدا سے اِس آزمایش میں ڈالے جانے کی التجا نہیں کی تھی۔ پھر اُسے اتنی بڑی آزمایش میں کیوں ڈالا گیا۔

اِس حوالے سے آپ سورۂ احزاب کی آیات ۷۲، ۷۳ دیکھیں۔ اُن میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اختیار و ارادہ کے ہوتے ہوئے اپنی اطاعت کے عہد کو ایک امانت کی حیثیت سے آسمانوں اور زمین پر پیش کیا، لیکن وہ اِسے اٹھانے سے ڈر گئے۔ یہ ڈر اِس بات کا تھا کہ کہیں ہم اِس امانت کی ذمہ داری ادا کرنے میں ناکام نہ ہو جائیں۔ اِن آیات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین نے تو اِس امانت کو نہ اٹھایا، لیکن انسان نے اِس امانت کو اٹھا لیا۔ چنانچہ یہ کہنا درست نہیں کہ ہم اِس آزمایش میں اپنے مرضی کے بغیر ڈالے گئے ہیں۔ آج گو ہم کو اس امانت کا اٹھانے کا شعور نہیں لیکن ہر آدمی اچھی طرح یہ دیکھ سکتا ہے کہ اس امانت کو قبول کرنا اس کی فطرت کا اقتضا ہے۔ (محمد رفیع مفتی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انکارِ رسول پر عذاب

سوال: آپ کہتے ہیں کہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عرب میں قیامتِ صغریٰ بپا کر کے دکھا دی گئی۔ حالانکہ سابقہ ادوار میں رسولوں کی دعوت کے نتیجے میں کافروں پر عذاب نازل ہوتے رہے، کیا وہ بھی اسی قسم کی قیامتیں تھیں اور بار بار واقع ہوئیں؟ کیا آیندہ بھی واقع ہوں گی، نہیں تو کیوں؟

(محمد بلال، مظفر گڑھ)

جواب: رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں جتنے عذاب بھی آئے ہیں، اُن کی نوعیت ہمارے خیال میں یہی ہے کہ وہ قیامتِ کبریٰ کا انکار کرنے والوں پر اس سے پہلے آنے والی قیامتِ صغریٰ ہوتی ہے جو آیندہ قوموں کے لیے ایک آیت بنتی ہے۔ اب چونکہ قرآنِ مجید کی شکل میں، اُس دینونت کی سرگزشت ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہے، خدا کی طرف سے دین اپنی مکمل شکل میں محفوظ ہو گیا ہے اور اب کسی نئی نبوت یا رسالت کی

ضرورت نہیں رہی، لہٰذا نبوت و رسالت کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے، اب نہ کسی رسول نے آنا ہے اور نہ براہِ راست مخاطبین کی طرف سے کسی رسول کی تکذیب کا امکان ہے۔ نتیجۃً رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں آنے والے عذاب کا بھی اب کوئی امکان نہیں ہے۔ (محمد رفیع مفتی)

زراعت اور زکوٰۃ

سوال: آج کل زراعت پر صنعت کی طرح بھاری خرچ آتا ہے جیسے کھاد، بیج، خرچہ ٹریکٹر، مالیہ، آبیانہ وغیرہ۔ یہ اخراجات منہا کر کے عشر نکالا جائے تو منافع کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ پیداوار بہت کم ہوگئی ہے اور منافع کا مارجن بہت کم ہے۔ آپ کا نقطہء نظر کیا ہے؟

(محمد بلال، مظفر گڑھ)

۱۰۔ ہمارے نزدیک اب چونکہ بارانی اور نہری دونوں نوعیت کی زراعت پر باقاعدہ کئی قسموں کے اخراجات ہوتے ہیں، لہٰذا، یہ یکساں نوعیت کی زمینیں شمار ہوں گی۔ چنانچہ ایک بات تو یہ ہے کہ زمین پر زکوٰۃ، عشر نہیں، نصفِ عشر ہوگی اور دوسری یہ کہ اب حکومت کو جو مالیہ وغیرہ دینا پڑتا ہے، وہ بھی اُس نصفِ عشر میں سے منہا کر کے دیا جائے گا۔ (محمد رفیع مفتی)

سنن کو جاننے کا معیار

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ جلسہ استراحت اور تورک وغیرہ ایسی سنن نہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت میں جاری کی ہیں آج اتنے سو سال بعد ہمارے پاس کون سا ایسا معیار ہے جس پر پرکھ کر ہم یہ معلوم کر سکیں کہ کون سا عمل سنتِ جاریہ ہے اور کون سا نہیں ہے۔ کیونکہ امت کے اندر بہت سے اعمال ایسے رائج ہیں جن کو سنت کے خلاف کہا جاتا ہے۔ عام آدمی کس طرح پہچان سکتا ہے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جب کہ وہ رہنمائی بھی اپنے ملک کے علما سے حاصل کرے گا جو کسی نہ کسی طرح ایک غیر مسنون عمل کو مسنون ثابت کر دیں گے۔ (محمد بلال، مظفر گڑھ)

جواب: سننِ جاریہ وہ سنن ہیں جن کے سنن ہونے پر اِس امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لہٰذا اِن سنن پر عمل تو ہر خاص و عام آدمی کرتا رہتا ہے، لیکن عام آدمی مجموعی دینی اعمال میں سے سننِ جاریہ کو الگ نہیں کر سکتا۔ یہ اُسے علما ہی سے دریافت کرنا ہوگا۔ آپ کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنے مسلک کے علما سے سننِ جاریہ کے بارے سوال کرے گا، تو وہ اُسے اپنے نقطۂ نظر ہی کے مطابق جواب دیں گے، ظاہر ہے اُنھیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اِس صورت میں آپ کا اشکال غالباً یہ ہے کہ ہوسکتا ہے وہ علما ایک ایسی چیز کو سنت قرار دے دیں، جو سننِ جاریہ کا نقطۂ نظر پیش کرنے والوں کے نزدیک سنت نہ ہو۔ اِس معاملہ میں مَیں تو یہی کہوں گا کہ پوچھنے والے کو چاہیے کہ وہ خود جس نقطۂ نظر کا قائل ہے، اُسی نقطۂ نظر کے علما سے معلومات حاصل کرے۔

(محمد رفیع مفتی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رفع یدین اور عملِ تواتر

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ رفع یدین کا مسئلہ اس وقت سے اٹھا ہے جب تواتر سے ملنے والے عمل کے بجائے حدیث کو نماز کا اصل مبنیٰ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیا آپ اس وقت کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟ اور وہ کون لوگ تھے جنھوں نے ایسا کیا؟ (محمد بلال، مظفر گڑھ)

جواب: میری بات ایک اصولی حقیقت پر مبنی ہے۔ اُسے آپ اِسی حوالے سے دیکھیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ امت نے نماز بخاری و مسلم کی احادیث سے نہیں سیکھی، بلکہ یہ دین کے اُس عملی تواتر سے سیکھی ہے، جس پر اصل دین یعنی قرآن و سنت کھڑے ہیں۔ اِس بات کا مطلب یہ ہے کہ جیسے امام بخاری رحمہ اللہ کو میسر آنے والی کوئی صحیح حدیث قرآن کی آیت میں تبدیلی نہیں کر سکتی، اِسی طرح کوئی صحیح حدیث نماز کی اُس شکل میں اضافہ یا کمی بھی نہیں کر سکتی، جو شکل ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جاری کردہ سنت سے ملی ہے۔ اگر نماز اپنی اصل میں راویوں کے ذریعے سے ملنے والی احادیث پر کھڑی ہوتی، تو پھر ہماری یہ بات ٹھیک نہ تھی۔ پھر جونہی کسی راوی

سے ہمیں کوئی حدیث ملتی ہم نماز کی شکل اُس حدیث کے مطابق کر لیتے۔ حدیث اور سنت کے فرق کے حوالے سے آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ حدیث ہمیں راوی سے ملتی ہے اور سنت ہمیں امت (کے عملی تواتر) سے ملتی ہے، اِس لحاظ سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ (محمد رفیع مفتی)

خدا کے اٹل قوانین اور مشرک

سوال: اللہ کے قوانین اٹل ہیں جیسے آگ ہر انسان کو جلاتی ہے خواہ وہ غلطی سے آگ میں ہاتھ ڈالے یا جان بوجھ کر۔ اسی طرح شرک ایک نا قابلِ معافی جرم ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ لہٰذا شرک خواہ کوئی سوچ سمجھ کر کرے یا غلط فہمی کی بنیاد پر اسے سزا ملنی چاہیے۔ یعنی خدا کا قانون اٹل ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی نجات کی امید رکھنا، کیا اس قانون کے خلاف نہیں؟ (محمد بلال، مظفر گڑھ)

جواب: جس طرح آگ کے لیے جلانے کا قانون ہے، اُس سے زیادہ بڑی حقیقت کے طور پر مشرک کے جہنم میں پڑنے کا قانون ہے۔ کوئی آدمی جب فی الواقع مشرک قرار پا جائے گا، تو اب اُس کا جہنم کی آگ میں جلنا لازمی ہے، لیکن جس طرح دنیا میں ہم یہ بات کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی فی الواقع آگ میں ہاتھ ڈالے گا تو اُس کا ہاتھ جلے گا، اِسی طرح اگر کوئی آدمی فی الواقع شرک کرے گا اور پھر مشرک ہی کی حیثیت سے مرے گا، تو وہ لازماً جہنم میں ڈالا جائے گا۔ لیکن وہ آدمی جو ہمیں کسی شرکیہ عمل میں پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے، اُس کا معاملہ کیا ہے، کیا اُسے ہم ایک حقیقی مشرک اور جہنمی آدمی سمجھیں اور اُسے ہم اُسی نگاہ سے دیکھیں، جس نگاہ سے اہلِ جنت اہلِ جہنم کو دیکھیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اِس یقین سے معاملہ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ہم کسی دوسرے کے بارے میں خدا کے حتمی فیصلے کو نہیں جانتے اور جو کچھ ہم نے دیکھا ہے، وہ سب کچھ ظاہری طور پر دیکھا ہے۔ چنانچہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ فلاں آدمی مشرکانہ عمل کر رہا ہے، کیونکہ یہ تو اُس کا ظاہر ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں آدمی دل سے پکا مشرک ہے، کیونکہ یہ اُس کا باطن ہے۔

بہر حال، اگر وہ خدا کے ہاں مشرک ہی شمار کیا گیا تو آپ تسلی رکھیں کہ پھر یہ بات آگ کے لیے جلانے کے قانون سے بھی زیادہ یقینی ہے کہ وہ مشرک آگ میں جھونکا جائے گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جو مثال آپ نے دی ہے اس میں اور شرک کرنے میں فرق ہے۔ جب کوئی آدمی آگ میں ہاتھ ڈالتا ہوا ہمیں نظر آتا ہے تو اب یہاں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ اس نے ہاتھ ڈالا بھی ہے یا نہیں جبکہ شرک چونکہ اصلاً دل کا عمل ہے اور وہ ہمیں کسی حسی چیز کی طرح دکھائی نہیں دیتا لہٰذا اس کے بارے میں حسی چیز کی طرح حکم بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ (محمد رفیع مفتی)

الجماعۃ اور خلیفہ

سوال: مملکتِ پاکستان مسلمانوں کا ایک نظم اجتماعی ہے اور یہاں کے مسلمان ''الجماعۃ'' ہیں۔ کیا اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ مسلمانوں کے اس نظمِ اجتماعی کا سربراہ بھی اسلام کے دورِ اولین کی طرح امیر المومنین اور خلیفہ کہلائے اور یہاں پر اسلامی قوانین نافذ ہوں اور اصولی طور پر نظام خلافت رائج ہو؟ (حبیب الرحمٰن خان، تونسہ)

جواب: بلاشبہ پاکستان کا نظم اجتماعی ''الجماعۃ'' ہی ہے۔ مگر اس کے سربراہ کے لیے شرعاً ضروری نہیں ہے کہ وہ امیر المومنین کہلائے۔ مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی کے سربراہ کا امیر المومنین، خلیفہ، صدر یا وزیر اعظم کہلانا تمدنی مسائل ہیں۔ دین و شریعت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ بلکہ جو لوگ اس ملک میں مسندِ اقتدار پر فائز ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام اسلامی قوانین تدریج اور حکمت کے ساتھ نافذ کریں۔ (محمد بلال)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اختر حسین عزمی

''مشاہداتِ حرم''

مصنف: مولانا امین احسن اصلاحی،

مرتب: مقبول الرحیم مفتی،

اشاعت: ۲۰۰۰ء،

صفحات: ۱۷۲،

قیمت: ۹۰ روپے،

ناشر: دارالتذکیر، رحمان مارکیٹ غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۹۵۸ء میں مولانا امین احسن اصلاحی نے حج ادا کرنے کے لیے سفر کیا۔ تقریباً تین ماہ کے اس سفر میں جو کچھ آپ کے مشاہدے میں آیا، آپ نے اسے ''مشاہداتِ حرم'' کے نام سے صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیا۔ محض زیبِ داستان کے لیے سفر نامہ لکھنا مولانا کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی تمہیدی گفتگو میں لکھا ہے کہ ان کا سفر نامہ لکھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، لیکن دورانِ حج میں انھوں نے حجاج کے ذہنوں میں حج سے متعلق الجھے ہوئے سوالات کی چبھن محسوس کی، جنھیں مولانا کے نزدیک سلجھانا ضروری تھا۔ دوسری طرف حکومتوں کی دفتری پابندیوں کی وجہ سے لوگ پریشان تھے جن کی اصلاح کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانا ضروری تھا۔ اور تیسرے حجازِ مقدس میں مادی ترقی کے ساتھ تہذیبِ مغرب کے سرعت سے پھیلتے ہوئے اثرات نے انھیں بے چین کر دیا۔ ان وجوہ کی بنا پر مولانا اصلاحی نے سفر نامہ لکھنا ضروری سمجھا۔

مولانا اصلاحی کا یہ سفر ایک طالبِ صادق کا سفر ہے جو طالب و مطلوب کے رشتے کو تلاش کر کے اس سے

پیمانِ وفا باندھنے کی فکر میں سرگرداں نظر آ تا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدات کو جیسے محسوس کرتا ہے ویسے ہی کسی کمی یا اضافے کے بغیر سپردِ قلم کر دیتا ہے۔ اس بات کا اظہار مولانا نے اس سفرنامے کے شروع میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''میں نے اس سفرنامے میں صرف انھی واقعات وحالات کا ذکر کیا ہے جن کا میرے دل پر کوئی نقش قائم رہ گیا تھا۔ میں نے وہ نقوش بے تکلف دل کے صفحے سے اٹھا کر کاغذ کے صفحات پر رکھ دیے ہیں۔ نہ کہ کسی بات کے یاد کرنے کے لیے حافظے پر زور ڈالا، نہ کہیں آرایشِ بیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور نہ کسی ایسی بات کو چھپانے ہی کی کوشش کی ہے جو دل کے صفحے پر موجود ہو۔'' (ص ۶)

مولانا نے اس سفرنامے میں ایک طرف تو ایک صاحبِ نظر عالمِ دین کی حیثیت سے اپنے مشاہدات، تجربات اور تاثرات رقم کیے ہیں اور دوسری طرف حج کے فکر وفلسفہ، بیت اللہ کی عظمت، حرمِ نبوی کی رفعت و منزلت اور حجاجِ کرام کے محاسن کے ساتھ ساتھ ان کی لغزشوں کو بھی اپنے قلبی جذبات اور احساسات کے سانچے میں ڈھال کر بڑی سادگی اور بے ساختگی سے بیان کیا ہے۔ اس طرح یہ سفرنامہ حصولِ معلومات کے ساتھ تزکیہءقلوب کا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔

اگرچہ سفرنامے میں مقدس مقامات سے متعلق تمام تفصیلات اور عبادات کی جزئیات سمو دی گئی ہیں، تاہم مولانا کا اصل ارتکاز اس داخلی تجربے اور مشاہدے پر ہے جس سے اکثر حجاج گزرتے ہیں، لیکن وارداتِ قلبی ہر ایک کی مختلف ہوتی ہے۔ اس میں جہاں حج کے عظیم اجتماع کی خارجی تصویر نظر آتی ہے، وہاں اس داخلی تعلق کی تصویر بھی دکھائی دیتی ہے جسے حجاجِ کرام حسبِ توفیق اللہ اور رسول سے ایمانی وجذباتی سطح پر محسوس کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ داخلیت اور خارجیت کے امتزاج سے تجربے اور مشاہدے کا ایسا جہان پیدا کیا ہے جس میں سانس لیتے ہوئے آدمی روحانی کیفیت سے سرشار ہو جاتا اور خود کو طوافِ کعبہ میں مشغول پاتا ہے۔

جذب وایمان کے ان دائروں کے باہر زندگی کا حقیقی رنگ بھی نظر آتا ہے، حرص ولالچ کے بازار، نفسانفسی کی کیفیت، نفس پرستی کے مناظر، بازارِ تمدن کی گہما گہمی اور سب سے بڑھ کر مغربی تہذیب کے اثرات جن سے سرزمینِ حجاز کا فطری حسن، اس کی رعنائی اور اصلیت مسخ ہو گئی ہے اور جسے مولانا کبھی مدینہ کے نواحی باغات میں تلاش کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی مدینہ کی پرانی گلیوں اور بازاروں میں ان سنگ وخشت کی جستجو کرتے دکھائی دیتے ہیں، جنھوں نے قرنِ اول کے اسلاف کی شوکت وعظمت اور رحمت ورأفت کے جلوے دیکھے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تھے۔مولانا نے اس سفر میں جو محسوس کیا، جو ان کے مشاہدے میں آیا اور جس دولتِ ایمان و یقین سے وہ فیض یاب ہوئے، اسے انھوں نے سب میں تقسیم کر دیا۔

۲۷ اصفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ ۱۹۵۹ء میں ماہنامہ ''المنبر'' فیصل آباد اور بعد ازاں ماہنامہ ''میثاق'' لاہور میں کئی اقساط میں شائع ہوا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ اسے کتابی شکل میں چھپوائیں لیکن ان کی دیگر مصروفیات کی وجہ سے یہ معاملہ نظر انداز ہوتا رہا۔ بالآخر ان کی وفات کے بعد ان کے ایک عقیدت مند مقبول الرحیم مفتی صاحب نے اسے کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ مرتب کے مطابق: ''یہ سفر نامہ مصنف کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق کسی اضافے کے بغیر شائع کیا گیا ہے۔'' اضافہ تو واقعی نہیں کیا گیا، البتہ اس میں ایک کمی ضرور رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ ''میثاق'' میں شائع شدہ اقساط میں تو وقوفِ عرفات کا ذکر ہے، لیکن اس کتاب میں اس کا قطعاً ذکر نہیں ہے، معلوم نہیں مرتب کی نظروں سے مناسکِ حج میں سے اتنا اہم واقعہ کیسے پوشیدہ رہ گیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عبدالحئی عابد

''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدّن کی تاریخ''

مصنف: عبداللہ یوسف علی

صفحات: ۳۹۸

قیمت: ۲۵۰روپے

پتا: دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

علامہ عبداللہ یوسف علی کا شمار برصغیر کے معروف اہل علم میں ہوتا ہے۔ آپ کا اصل کارنامہ انگریزی زبان میں قرآنِ مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے آپ کی تمام تصانیف علم و فضل اور تحقیق کا شاہکار ہیں۔ یہ کتاب بھی آپ کے تبحرِ علمی، اعلیٰ تحقیقی صلاحیتوں اور تاریخ پر دسترس کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے۔

یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں تصنیف کی گئی، جو انگریزوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ مصنف نے اہل اقتدار سے ڈرے بغیر جس بات کو حق سمجھا بیان کر دیا۔ کتاب کا زیرِ نظر نسخہ مئی ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے آغاز میں پروفیسر رفیع اللہ شہاب کے قلم سے کتاب اور مصنف کا مختصر تعارف شامل کیا گیا ہے۔

مصنف نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ۱۹۳۱ء تک کے تمدنی حالات پر تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے برصغیر کے تمدن کی تمام خوبیاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خرابیوں اور خامیوں پر بھی نظر رکھی ہے۔ اسی طرح انھوں نے انگریزی عہد کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے بغیر کسی تعصب کے ان کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ایک اچھے محقق کی طرح آپ نے اول تا آخر غیر جانب دارانہ طور پر معاملات کو بیان کیا ہے۔ مقدمے میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، میں تو مشہور لاطینی کامیڈی کے ایک شخص کی طرح اس عقیدے کا

قائل ہوں کہ کوئی ایسی چیز جس کی بنیاد فطرتِ انسانی کی مضبوط چٹان پر قائم ہو، غیر ملکی نہیں کہ سکتی۔''
(ص ۲۴)

مصنف نے ہندوستانی تمدن کے تقریباً ہر پہلو اور ہر شعبے سے تعرض کیا ہے۔ آپ نے ان تمام چیزوں کو جن کا کسی قوم کے رجحانات اور تمدن سے تعلق ہوتا ہے، بیان کیا ہے۔ مثلاً ادب، تعلیم، اطوار و اخلاق، ثقافت، مذہب، معیشت، معاشرت، سیاست، اخبار نویسی، فنونِ لطیفہ اور صنعت و حرفت وغیرہ تمام موضوعات کو اس کتاب میں زیرِ بحث لائے ہیں۔

کتاب کو سات حصوں اور بارہ ابواب میں تقسیم کر کے اٹھارویں صدی کے آغاز سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اس عرصے میں ہندوستان کا تمدن ارتقا و تبدیلی کی جن منازل سے گزرا سب کا مرحلہ وار ذکر کیا ہے۔ پہلا حصہ: ''عین ما قبل'' کے عنوان سے اس دور کی تصویر کشی کرتا ہے جب انگریز ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہاں قدم جمانے کے بعد معیشت پر قابض ہوئے اور پھر ملکی سیاست میں مداخلت کرنے لگے۔ انھوں نے جہاں بھی ان کا بس چلا، لوٹ مار کی انتہا کر دی۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے رشوت اور دیگر غیر اخلاقی حربوں سے بھی کام کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے کمپنی کے معاملات میں ہیر پھیر سے کام لیا اور مقامی لوگوں کے ساتھ مالی معاملات میں بھی لوٹ مار کی۔ یہ لوگ چونکہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے، لہٰذا جب انھیں اقتدار و اختیار حاصل ہوا تو اس وقت بھی اسی ذہنیت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ مصنف لکھتے ہیں:

''جب تجارتی معاملات ہی میں کمپنی کے ملازم بلند نظری سے عاری تھے تو ان سے ملکی معامت میں بلند خیالی اور حکمتِ عملی کی توقع رکھنا بعید از عقل تھا۔'' (ص ۴۲)

کمپنی کے ملازم ہونے کے باوجود تجارتی معاملے میں یہ لوگ ذاتی مفادات کو کمپنی کے مفادات پر بھی ترجیح دیتے تھے، اس لیے ہندوستان کی حیثیت ان کی نظروں میں سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی جسے وہ سارے انڈے بیک وقت حاصل کرنے کے لیے ذبح کرنے پر بھی تیار تھے۔ پہلے پہل انگریزوں نے ہندوستان کے تجارتی معاملات پر قابض ہونے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے ہر قسم کے ناجائز حربے آزمائے۔ ہندوستانی تجارت، صنعت اور معیشت کو ان کے ہتھکنڈوں نے شدید نقصان پہنچایا زرعی پیداوار پر لگان اور تجارت پر محصول کی بہت زیادہ شرحیں عائد کیں اور غیر معیاری برطانوی مصنوعات کے لیے منڈی مہیا کی۔ پھر آہستہ آہستہ مقامی افراد کو ہٹا کر خود ہر چیز پر قابض ہو گئے۔ اسی طرح سیاست، تعلیم، مذہب، ادب، ثقافت اور دیگر شعبوں میں من مانی کرتے اور لوگوں کو اپنی پیروی پر مجبور کرتے رہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ تین ابواب پر مشتمل ہے اور ۱۷۷۳ء سے ۱۸۱۸ء کے عرصے کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب انگریز ہندوستان کے حکمران بن گئے تھے۔ ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد انگریزوں نے جو لوٹ مار مچائی تھی، اس کے برعکس حکمرانی حاصل ہونے کے بعد انھوں نے بہت سے اچھے کام کیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اقتدار حاصل ہونے کے ساتھ ہی برطانیہ سے اعلیٰ طبقے کے لوگ، دانش ور، ادیب، فن کار اور تربیت یافتہ افراد ہندوستان میں آنا شروع ہو گئے۔ لیکن یہاں انھوں نے اپنے افکار، علوم، قوانین اور ثقافت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ، ہندوستانی علوم، مذاہب، فنون اور صنعتوں کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اپنے اقتدار کو طول دینے کی غرض سے ہندوستانی اقوام کے درمیان مذہبی، سیاسی اور لسانی فرقہ داریت کو ہوا دینی شروع کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی آپس میں دست و گریباں ہو گئے اور انگریزوں کے لیے اپنے مقاصد حاصل کرنا آسان ہو گیا۔

کتاب کے اس حصے میں مصنف نے غالب تہذیب اور مغلوب تہذیب کے ملاپ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں برطانوی اور ہندوستانی تمدن کے اختلاط کے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تیسرے حصے کا عنوان ہے: ''نیا نظام بتدریج اثر انداز ہوتا ہے''۔ اس میں ان تمام مکاتبِ فکر کا ذکر بھی ہے جو نئی تہذیب سے براہِ راست متاثر ہوئے اور ان کا بھی جنھوں نے برطانوی فکر کے سامنے مزاحمت کی۔ علم و ادب، فنون اور قوانین میں نت نئی تبدیلیوں، جدید تحریکات اور برطانوی فکر کے اثرات کا ذکر بھی موجود ہے۔ مصنف نے زندگی کے تمام شعبوں میں بتدریج اثر انداز ہونے والے برطانوی افکار کا جائزہ اس طریقے سے لیا ہے کہ درجہ بدرجہ ہر شعبے کو انفرادی طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔

چوتھا حصہ ''پرانے نظام کی آخری کش مکش'' کے عنوان سے ہے، جو صرف ایک باب پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، اس وقت کے حالات، بغاوت کے وجوہ اور اس کی تمدنی اہمیت پر بحث کرتا ہے۔

دو ابواب پر مشتمل پانچویں حصے کا عنوان ''انگریزی خیالات کا غلبہ'' ہے۔ یہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۸۵ء کے عرصے کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں مصنف نے ہندوستان کی تمام مذہبی، ادبی، فنی اور سیاسی تحریکوں پر غالب نظام کے بڑھتے ہوئے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ نئے نظام میں جو لوگ مزاحمت اور مخالفت کی پالیسی پر عمل پیرا رہے وہ ترقی کی دوڑ میں ان لوگوں سے بہت پیچھے رہ گئے جنھوں نے نئی تہذیب کو قبول کر لیا۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے لوگ برطانوی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ زراعت اور پرانی

صنعتیں بحران کا شکار ہوگئیں اور دیہاتوں سے شہروں کی طرف جانے کا رجحان بڑھتا گیا۔ انگریزی زبان سے مختلف علوم کا اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہوا ادبی اور ثقافتی فاصلے کم ہوئے۔ بعض لوگوں نے غالب تہذیب کے رنگ کو زیادہ قبول کیا اور جن لوگوں نے مزاحمت کی وہ گمنامی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ مصنف نے مختلف انتظامی شعبوں، تجارت، ایجادات، صنعت وحرفت اور سیاست کے بارے میں اس دور کے حالات کو مختلف عنوانوں کے تحت قلم بند کیا ہے۔

چھٹا حصہ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۷ء کے عرصے پر محیط ہے۔ اس کا عنوان ''قومی احساس کی بیداری'' ہے اور یہ ایک باب پر مشتمل ہے۔ اس عرصے کا سب سے اہم واقعہ ہندوستان کے لوگوں میں انگریزوں سے نجات کے احساس کا شدت سے بیدار ہونا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت بڑھتی گئی۔ اس میں بنیادی کردار تو انگریز ہی کا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے عاقبت نااندیش لوگوں کا بھی کافی ہاتھ تھا۔ مصنف نے اس دور کی تحاریک اور سیاسی وسماجی صورتِ حال پر تفصیل سے لکھا ہے۔

''تازہ ترین واقعات'' کے عنوان کے، ایک باب پر مشتمل، ساتواں حصہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۱ء یعنی کتاب کے زمانۂ تصنیف تک کے حالات کا آئینہ قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مصنف نے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات، جنگ عظیم، انگریزوں کی پالیسیوں اور انگریزوں کے خلاف ہندوستانی عوام کی حکمت عملی کا تذکرہ کیا ہے۔

مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں بہت محنت اور تلاش وجستجو سے کام لیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تین سو سے زائد مصادر سے استفادہ کیا، جن کی تفصیل کتاب کے آخر میں درج ہے۔ چونکہ مصنف کا مقصد ہندوستان کے تمدن کی تاریخ مرتب کرنا نہیں بلکہ تمدن کی تشکیل کے پیچھے کارفرما عناصر کا جائزہ لینا ہے، اس لیے تمام مباحث تفصیلات سے عاری ہیں۔ مصنف نے ہر چیز پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ یقیناً بہت کم ایسے موضوعات ہوں گے جو اس کتاب میں شامل نہیں ہیں۔

ہندوستان اور اس کے تمدن کے مطالعے میں دل چسپی رکھنے والے طلبہ اور اہل علم کے لیے یہ کتاب ایک عمدہ رہنما ثابت ہوسکتی ہے۔ زیرِ نظر نسخہ ۱۹۹۴ء میں شائع کیا گیا ہے اور دور جدید کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ البتہ پروف ریڈنگ کی غلطیاں چند ایک مقامات پر موجود ہیں۔ کتاب میں حوالہ جات کا جگہ جگہ اہتمام کیا گیا ہے، جن کی فہرست، ابواب کے لحاظ سے کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔ یہ خصوصیات اس کتاب کو محققین کے لیے مزید مفید بنا دیتی ہیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

شعائر اللہ اور فطرت اللہ

''شِعار'' اس لباس کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اس کے مقابل میں ''دِثار'' کا لفظ بولا جاتا ہے یہ وہ لباس ہوتا ہے جو حسبِ ضرورت جسم سے الگ کر کے رکھ لیتے ہیں، جیسے چادر اور اوڑھنی۔ یوں ''شِعار'' کے لفظ میں شئ لازم کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ پھر یہ جنگ اور سفر کے دوران میں پکارے جانے والے کسی خاص نعرے کے لیے استعمال ہونے لگا، جس سے لوگ ایک دوسرے کو بلاتے ہیں یا للکار کر دشمن پر حملہ کر دیتے ہیں، جیسے جنگِ بدر میں مہاجرین یا بنی عبد الرحمن کہہ کر ایک دوسرے کو پکارتے تھے۔ اوس یا بنی عبید اللہ اور خزرج یا بنی عبد اللہ پکار کر ایک دوسرے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ، ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۲۷۴)

ایک اور غزوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'حٰمٓ۔ لا ینصرون' شعار مقرر فرمایا۔ (سنن ابوداؤد، کتاب الجہاد) آج کل سلوگن، ماٹو اور 'Coat of arms' کے الفاظ اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عوام کی طاقت ان کے سلوگن میں ہوتی ہے۔ ایسے ہی اسکول اور کالج اپنا ایک ماٹو مقرر کرتے ہیں اور طلبہ کو اسے مدِ نظر رکھنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ملکی سطح پر قومی ترانہ، قومی جھنڈا، قومی کھیل اور قومی پھول شناخت کا کام انجام دیتے ہیں۔

''شِعار'' سے ملتا جلتا لفظ ''شعیرہ'' ہے، جس کی جمع شعائر ہے۔ ''شعیرہ'' کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ حج کے اعمال و مناسک کے لیے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: 'ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ'۔ (بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں)۔ (البقرہ ۲: ۱۵۸)

اسلام کے ابتدائی زمانے میں صحابہ سعی بین الصفا والمروہ سے کراہت محسوس کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ شعائر جاہلیت میں سے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مطلع کیا کہ صفا اور مروہ جاہلیت کے نہیں بلکہ اللہ کے شعائر میں شامل ہیں۔ سورۂ حج میں ارشاد ہے: 'والبدن جعلنها لكم من شعائر الله لكم فيها خير '۔(اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائرِ الٰہی میں سے ٹھیرایا ہے۔ تمھارے لیے ان میں بڑے خیر ہیں)۔(۲۲:۳۶) پھر یہ بھی فرمایا: 'لن ينال الله لحومها ولا دمآؤها ولكن يناله التقوىٰ منكم '۔(نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں اور نہ خون۔ لیکن تمھارے اندر کا تقویٰ اس تک رسائی پاتا ہے)۔ (۲۲:۳۷) اونٹ عربوں کا محبوب اور سب سے بڑھ کر کام آنے والے جانور تھا۔ یہود اس کی حرمت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اس لیے ہدی کے اونٹوں کے شعائر اللہ میں سے ہونے کا بطورِ خاص تذکرہ فرمایا اور یہ بھی بتایا کہ ان کے خون اور گوشت کا اللہ کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ جذبۂ عبودیت اور خدا ترسی کے ساتھ ان کی قربانی ہی اللہ کو مطلوب ہے۔

سنن ابنِ ماجہ، کتاب المناسک میں، زید بن خالد الجھنی رضی اللہ عنہ سے اور مسندِ احمد میں ان سے اور حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: 'يا محمد مر اصحابك فلير فعوا اصواتهم بالتلبية فانها من شعار الحج '۔(اے محمد، اپنے صحابہ کو حکم فرمائیں کہ تلبیہ پڑھتے ہوئے آواز بلند رکھیں کیونکہ یہ شعارِ حج میں سے ہے)۔

ان شواہد سے پتا چلتا ہے کہ قرآن وحدیث میں شعار اور شعائر کے الفاظ خصوصاً مناسکِ حج کے لیے ہی استعمال ہوئے ہیں۔ سورۂ حج میں ان کے لیے حرمت کا لفظ بھی آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شعائر محترم اور قابلِ تعظیم ہیں۔ البتہ اردو اور فارسی لٹریچر میں شعائر کا لفظ عام معنوں میں بولا جاتا ہے۔ تمام مذہبی رسوم، عبادات اور مقدس مقامات ان میں شامل ہو جاتے ہیں اور یہ انگریزی لفظ 'Ritual' کے قائم مقام ہو گیا ہے۔ اسے زبان کا توسع کہا جا سکتا ہے لیکن خود قرآن وحدیث کے جو نظائر ہم نے پیش کیے ہیں ان کا اسلوب بتاتا ہے کہ صرف افعالِ حج ہی شعائر اللہ نہیں ہیں بلکہ یہ شعائر اللہ میں شامل ہیں اور ان میں سے کچھ ہیں۔ جیسے 'من شعائر الله '(شعائر اللہ میں سے۔ شعائر اللہ کی نوعیت والے) 'من شِعار الحج' (عملِ حج میں سے) کی تراکیب سے رہنمائی ملتی ہے۔ چونکہ باقی عبادات اور دینی اہمیت رکھنے والے مقامات کا صراحت سے ذکر نہیں ہوا اس لیے ہم ان کو تبعاً شعائر اللہ کہیں گے کیونکہ یہ لغتہً وعرفاً اس معنی میں شامل ہیں۔ افعالِ حج کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شعائراللہ میں سے ہونے کی صراحت اسی لیے کی گئی کہ زمانہء جاہلیت کی بعض قبیح رسمیں حج میں شامل ہوگئی تھیں اور صحابہء کرام سعی اور قربانی کے بارے میں کچھ شبہات رکھتے تھے۔ مشرکانہ رسوم کی نفی کر کے اصل مناسک کے بارے میں بتادیا گیا کہ ان کو بغیر جھجک کے بجالاؤ کیونکہ یہ اللہ کی قربت اور ثواب کا سبب ہیں۔

شعائراللہ کی طرح ایک اور ترکیب فطرت اللہ ہے جو قرآنِ مجید کی سورۂ روم آیت ۳۰ میں آئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:'فاقم وجهك للدين حنيفا ۔ فطرت الله الّتى فطر الناس عليها ' ۔(پس اے نبی، آپ یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف جما دیں اور اس فطرت پر برقرار رہیں جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے) فطرت سے مراد وہ فطری استعداد و صلاحیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر بندے میں ودیعت کی ہے۔ اس صلاحیت کو استعمال کر کے آدمی حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے اور دینِ توحید تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ مرتے دم تک اور ہوش و حواس کے قائم رہنے تک موجود رہتی ہے اور کوئی اس کو کھرچ نہیں سکتا۔ لاکھ بدلنے کی کوشش کریں، یہ نہیں بدلتی۔ اور جب ہوائے نفس اور تزئینِ شیطان کے ڈالے ہوئے حجاب اٹھتے ہیں تو دین کی سیدھی راہ نظر آنے لگتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'مامن مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه او ينصرانه اويمجسانه كما تنتج البهيمه جمآء هل تحسون فيها من جدعاء' ۔(ہر نومولود فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، عیسائی یا پارسی بنا ڈالتے ہیں۔ جیسے ایک چوپایہ سالم چوپائے کی شکل میں پیدا ہوتا ہے کیا تم نے دیکھا کہ ان میں کوئی بوچا [کانوں سے محروم] پیدا ہوا ہو)۔(صحیح بخاری، کتاب الجنائز) چوپائے کی مثال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرکانہ رسم واضح کرنے کے لیے دی۔ جب ایک اونٹنی پانچ بچے جن لیتی اور آخری نر ہوتا تو اس کے کان چیر کر اس کو بوچا بنا دیتے۔ اس کا دودھ پیتے اور نہ اس پر سواری کرتے۔ جہاں اس کا دل چاہتا چرتی پھرتی۔ اسے ''بحیرہ'' کا نام دیا جاتا۔ (المائدہ ۵:۱۰۳) اس میں ایک لطیف سا اشارہ کافروں کے اعراض کی طرف بھی ہے کہ وہ کان لپیٹ کر دینِ فطرت سے بہرے ہو چکے ہیں۔

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہ نے سورۂ روم کی یہی آیت تلاوت کر دی۔ اس سے پتا چلا کہ فطرت دینِ توحید و اسلام پر قائم ہونا ہے جبکہ شرک و کفر فطرت کی نفی ہے۔

فطرت اللہ کا ایک مظہر وہ جسمانی ساخت و ہیئت بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس ہیئت کو برقرار رکھیں اور اس کی آرایش اور اصلاح اس طرح کریں کہ یہ ساخت بگڑنے نہ پائے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

جسمانی فطرت کو قائم رکھنے اور جسم کی صفائی وستھرائی کے قاعدے، ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی نشانی ہیں اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہمیں ملے ہیں۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس میں حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں: 'سمعت النبی ، یقول الفطرة خمس : الختان والاستحداد و قص الشارب و تقلیم الاظفار و نتف الآباط ، ۔(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔ پانچ چیزیں فطرت ہیں: ختنہ کرانا، زیر ناف بال صاف کرنا، مونچھیں چھوٹی کرانا، ناخنوں کو کاٹنا اور بغلوں کے بال اکھاڑنا) صحیح مسلم کتاب الطہارہ میں حضرت عائشہ کی روایت میں دس چیزیں بیان ہوئی ہیں۔ اس میں 'اعفاء اللحية' ۔(داڑھی کا بڑھانا۔ مسواک کرنا) 'استنشاق الماء'۔(ناک میں پانی چڑھا کر صاف کرنا) 'غسل البراجم' ۔(انگلیوں کے جوڑوں کی میل دھونا) 'انتقاص الماء'۔ (پانی سے استنجا کرنا) اور 'المضمضه' (کلی کرنے) کے اضافے ہیں۔ ختنے کا ذکر نہیں ہوا۔ بحیثیت مجموعی یہ جسم کی صفائی کرنے اور اسے خوب صورت رکھنے کے ضابطے ہیں۔ طبری نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ وہ خصائل ہیں جن کے ذریعے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جانچا گیا۔ یعنی انھیں ان اطوار کی تعلیم دی گئی۔ (جامع البیان الجزء الاول ص ۴۱۴۔۴۱۵)

اب یہ مسلمان اور کافر کے درمیان نشانِ تفریق بن گئے ہیں۔ چنانچہ ایک آدمی نے اسلام قبول کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ کفر کے بال صاف کرو اور ختنہ کراؤ۔ (مسند احمد۔ مسند المکیین حدیث ابی کلیب)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فطرت اللہ پر برقرار رہ کر ہی ہم دینِ اسلام پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اسی فطرت سے توحید پھوٹتی ہے، شرک کی آلودگی دور ہوتی ہے اور عقائد کا فساد ختم ہوتا ہے۔ وحی کی تعلیم اسی فطرت کو چمکا کر اسے جلا بخشتی ہے۔ اس فطرت کی روشنی ہی میں ہم اپنے وجود اور اپنی وضع قطع کو اصل حالت میں باقی رکھ سکتے ہیں۔ اس فطرت کے منافی تزئین و آرایش جسم میں بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ کافر فطرت کو مسخ کر کے خیالات و اعمال کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

ایسے ہی شعائر اللہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ہیں۔ ان کی تعظیم خود اللہ کی تعظیم ہے۔ 'ذلك ومن يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب ، ۔(ان امور کا اہتمام رکھو۔ اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے)۔ (الحج ۲۲:۳۲) ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اپنی طرف

سے کوئی شعیرہ مقرر کر لیں یا اللہ نے تعظیم کا جو طریقہ بتایا ہے اسے چھوڑ کر اپنی مرضی سے طریقۂ تعظیم وضع کر لیں۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا اشارے سے استلام کرنا شعیرہ ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان پہلے آہستہ پھر تیز چلنا، شعار ہے۔

بیت اللہ کا طواف کرنا ہی عبادت ہے۔ نماز اور روزے کے جن آداب کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے، انھیں اسی طرح بجالانا ہی ہمارے لیے عبادت ہے۔ ان میں اپنی طرف سے کمی بیشی کرنا جائز نہیں۔ اپنی طرف سے نئے مقدس مقامات بنالینا بھی درست نہیں کیونکہ اس سے شرک کی راہ کھلتی ہے۔

فطرت اللہ اور شعائر اللہ دین کے دو پہلو ہیں، جو مختلف بھی ہیں اور آپس میں مربوط بھی۔ کچھ باتیں ہمیں اپنی عقل سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور کچھ کتاب و سنت کی رہنمائی سے معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ اپنی عقل کو عقلِ سلیم بنائیں اور کتاب و سنت سے ہدایت حاصل کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۵دسمبر ۲۰۰۰

محترمی ومکرمی مدیرِ ''اشراق''

السلام علیکم

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

ایک علمی مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سورہ نساء میں ہے: ''اوراہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہے جواس کی موت سے پہلے اس کا یقین نہ کرلے اورقیامت کے دن وہ ان پرگواہ ہوگا۔'' (۴:۱۵۹)

اس آیت کے مفسرین نے عموماً دو معنی بیان کیے ہیں۔ایک یہ کہ جب سیدنا مسیح علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے،اُس وقت تمام اہلِ کتاب اپنی موت سے قبل ان پر ایمان لے آئیں گے۔دوسرے یہ کہ جب مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیامیں تشریف لائیں گے،اس وقت آپ کی موت سے قبل جتنے اہلِ کتاب ہوں گے، وہ آپ پر ایمان لےآئیں گے۔

مگر یہ تفسیر میری سمجھ میں نہیں آرہی۔میرا یہ خیال ہے کہ اس آیت میں حضرت مسیح کی مذکورہ آمد کا اور آپ پر تمام اہلِ کتاب کے ایمان لانے کا ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔

اگراس بات کو مان لیا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کے وقت تمام اہلِ کتاب آپ پر ایمان لے آئیں گے تو یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جب آپ دوبارہ دنیامیں تشریف لائیں گے تو:

۱۔اس وقت آپ نبی ورسول کی حیثیت سے آئیں گے یا ایک امتی کی حیثیت سے؟

۲۔اگرآپ نبی کی حیثیت سے آئیں گے تو اس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ علیہ السلام کی

کیا حیثیت ہو گی؟

۳۔ کیا حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد کسی رسول یا نبی کی آمد ہو سکتی ہے؟

۴۔ اور اگر مسیح علیہ السلام ایک امتی کی حیثیت سے دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو کیا کسی امتی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر مسلموں، یعنی اہلِ کتاب سے کہے کہ مجھ پر ایمان لے آؤ؟

۵۔ قرآن و حدیث میں جہاں اہلِ کتاب کو دعوت دی گئی ہے، کیا وہاں یہ بات ان سے کہی گئی ہے کہ تم ایک امتی پر بھی ایمان لاؤ؟

۶۔ کیا تورات اور انجیل میں اہلِ کتاب کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم کو امتِ محمدیہ کے ایک امتی پر بھی ایمان لانا ہو گا؟

۷۔ کیا اُس وقت تمام اہلِ کتاب مسلمان ہو جائیں گے، یعنی یہودی اور عیسائی دنیا سے ختم ہو جائیں گے؟ لیکن قرآنِ مجید سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اور عیسائی قیامت کے دن تک رہیں گے اور عیسائی یہودیوں پر غالب رہیں گے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے: ''جبکہ اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ، میں تمھیں قبض کر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان سے تمھیں پاک کرنے والا ہوں۔ اور جن لوگوں نے تمھاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لیے ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں۔''

اس آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اہلِ کتاب کے دونوں گروہ یہودی اور عیسائی قیامت تک رہیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کا پیرو گروہ یعنی عیسائی آپ کے منکرین، یعنی یہودیوں پر قیامت کے دن تک غالب رہے گا۔

اس کے علاوہ قرآن مجید عیسیٰ علیہ السلام کی آمدِ ثانی اور آپ کے ہاتھوں یہود کے قتل اور عیسائیوں کے اسلام قبول کر لینے کے بجائے ایک دوسری بات کرتا نظر آ رہا ہے۔

سورۂ مائدہ میں ہے: ''اور جب کہا اللہ نے اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود ٹھیرا لو۔ اس نے کہا تو پاک ہے میرے لیے (روا) نہیں کہ میں (ایسی بات) کہوں جس کا مجھے حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوتا تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے بے شک تو چھپی باتوں کو جاننے والا ہے۔ میں نے انھیں نہیں کہا مگر صرف وہ جس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا تو نے مجھے حکم دیا کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا رب ہے۔ اور میں جب تک ان میں رہا ان پر خبر دار (باخبر) تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو ان پر تو نگران تھا اور تو ہر شے سے باخبر ہے۔'' (۵: ۱۱۶۔ ۱۱۷)

اس آیت میں یہ جملہ کہ ''جب تو نے مجھے اپنی طرف اٹھا لیا تو تُو ہی ان پر نگران تھا''، سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں دوبارہ نہیں آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ نے دوبارہ دنیا میں آ کر تمام عیسائیوں کو مسلمان کر دیا ہوتا تو پھر اس مکالمہ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام ''اے اللہ، میرے بعد تو ان پر تھا'' کہنے کے بجائے فرماتے کہ ''اے اللہ، جب تو نے مجھے دوبارہ دنیا میں بھیجا تو میں نے یہ بات کہنے والے سب لوگوں کو مسلمان نہیں کر دیا تھا''۔ مزید فرماتے کہ ''اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے ان سب کو دوبارہ دعوت دے کر اس بات سے منع کر دیا تھا۔'' اور اگر اللہ نے آپ کو دوبارہ دنیا میں بھیج کر آپ کے ذریعے سے آپ کو اور آپ کی والدہ کو معبود قرار دینے والوں کو مسلمان کرا دیا ہوتا تو اللہ ان سے کیوں پوچھتے کہ کیا تو نے ان سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو۔

سورۂ نسا میں ہے: ''اور بہ سبب ان کے اس دعویٰ کے کہ ہم نے مسیح بن مریم، اللہ کے رسول، کو قتل کیا۔ حالانکہ نہ تو انھوں نے اس کو قتل کیا نہ سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا۔ اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ اس کے معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں، بس گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ قتل اس کو انھوں نے ہرگز نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں ہے جو اس کی موت سے پہلے اس کا یقین نہ کر لے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔'' (۴: ۱۵۷۔ ۱۵۹)

سورۂ نساء کی اس آیت کو سیاق وسباق کے لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کی بداعمالیاں بیان کر رہے ہیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ہم نے مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کے اس دعوے کی تردید کر دی اور فرمایا کہ انھوں نے ان کو نہ قتل کیا اور نہ سولی دیا ہے۔ بس یہ ایسے ہی اٹکل پچو باتیں کر رہے ہیں اور یقیناً وہ قتل نہیں ہوئے، بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور یہ اہلِ کتاب جو آپ کے سامنے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے ان کو قتل کر دیا ہے، یہ سب اپنی موت سے قبل اس بات کو مان جائیں گے کہ نہ وہ قتل کیے گئے اور نہ سولی دیئے گئے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہی دیں گے کہ مجھے نہ یہ قتل کر سکے اور نہ سولی دے سکے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ فرمایا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا؟ یعنی ختمِ نبوت کے حوالے سے بھی حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سوالات کے بارے میں اہلِ علم اپنا نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں اور آپ اسے ''اشراق'' میں شائع کریں۔

اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام

محمد طارق، لاہور

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

—— جاوید

ایک کہانی

(بچوں کے لیے)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آؤ بچو ، سنو کہانی　　میٹھی میٹھی ، نئی پرانی
ابراہیم، جنید اور مریم　　تینوں بیٹھے تھے کچھ برہم
میں نے پوچھا: بات کیا ہے!　　آنکھوں کی برسات کیا ہے!
روتے روتے رک کر بولے　　ہم بیٹھے تھے بستہ کھولے
اِس نے میری گیند اٹھا لی　　اِس نے لے کر ٹافی کھا لی
مجھ کو یہ امی نے دی تھی　　میں نے یہ بازار سے لی تھی
اِس کا بلا اب میں لوں گا　　اِس کی گڑیا میں چھینوں گا
مریم بھی کیوں پیچھے رہتی　　اپنی گڑیا کا غم سہتی
اٹھی، جھپٹی، چیخ کے بولی　　تب ماروں گی تم کو گولی
اِس کو ہاتھ لگا کر دیکھو　　اِس کے پاس تو جا کر دیکھو

ٹھیرو، ٹھیرو، چپ ہو جاؤ   لڑنا بھڑنا چھوڑ کے آؤ

تم نے پِلّوں کو دیکھا ہے   بلّی، بلّوں کو دیکھا ہے

چھینا جھپٹی اُن کو بھائے   لپّا ڈگی بھی خوش آئے

تم تو آدم زاد ہو ، بچو   حوّا کی اولاد ہو، بچو

عقل سے بہرہ یاب ہوئے ہو   علم سے عالم تاب ہوئے ہو

آؤ، یہ سب باتیں چھوڑیں   شیطانوں سے رشتہ توڑیں

اپنے رب سے لینا سیکھیں
باقی سب کو دینا سیکھیں

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com